ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی

دیباچہ مترجم

دنیا کی مہذب زبانوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو گی جسمیں
شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ سب سے پہلے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں
اکبر اعظم کے زمانے میں فیضی جیسے قادر الکلام شاعر نے کیا۔ یہ ترجمہ آزاد ترجمہ ہے
فیضی نے اس میں یہ کامیاب کوشش کی ہے۔ کہ ترجمہ اور شعر کی خوبی کے ساتھ
ساتھ اصل مضمون کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ طالب علمی کے زمانے میں میں
نے فیضی کا ترجمہ پڑھا۔ اس کے اکثر برجستہ اشعار لوح ذہن پر ثبت ہو گئے۔ میں
اس زمانے میں بھی اچھے خاصے اشعار کہہ لیتا تھا۔ لیکن طالب علمانہ تاب سخن اتنی
نہ تھی۔ کہ اس عظیم الشان صحیفے کے ترجمے کی جرأت کر سکتا۔ اس کے بعد ربع
صدی کے دوران میں مَیں نے بھگوت گیتا کے کئی ترجمے پڑھے۔ کچھ انگریزی نثر
میں کچھ انگریزی نظم میں۔ کچھ اردو نثر میں کچھ اُردو نظم میں اس کے علاوہ گیتا کی
تعلیم پر بھی متعدد مضامین اور کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کوئی پانچ چھ سال کا
عرصہ ہوا۔ کہ یک بیک طبیعت میں یہ تحریک پیدا ہوئی۔ کہ اس کا ترجمہ صاف
اور سلیس اُردو نظم میں کرنا چاہیئے۔ اس سے پہلے اردو کا نظم میں جو ترجمہ میری نظر
سے گزرا تھا وہ اس قدر لفظی تھا۔ کہ پابندی الفاظ نے اصل مضمون کی روح کو
سلب کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ کسی کتاب کا بھی ہو۔ نہایت مشکل چیز ہے۔
ہر زبان کی اپنی ایک مخصوص روح ہوتی ہے ۔اس سے بڑھکر یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا

کہ ہر اچھے جملے کی ایک مخصوص رُوح ہوتی ہے۔ اسکے اندر معنی اور لفظ روح اور قالب
کیطرح ہوتے ہیں۔ روح اپنا قالب خود بناتی ہے۔ کوئی ایک روح کسی دوسری روح کا قالب اختیار
نہیں کر سکتی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اچھے سے اچھا ترجمہ بھی ایسا ہوتا ہے۔۔
جیسے کسی کاڑھے ہوئے کپڑے کی اُلٹی طرف۔ اُلٹی طرف سے نقش و نگار کے خاکے
کا اندازہ تو ہو سکتا ہے لیکن اصلی نقش و نگار کی روح جمال اس میں مسخ ہو جاتی ہے۔
مذہبی صحیفوں کا ترجمہ خاص طور پر مترجم کو بڑے تذبذب میں ڈال دیتا ہے
میرا خیال ہے۔ کہ کسی مذہبی صحیفے کا ترجمہ پورے طور پر اس کا حق ادا نہیں کر سکتا
میں سنسکرت دان نہیں۔ اگر لفظی پابندی اور اتقان کا سوال ہوتا۔ تو میں اس
کی طرف توجہ ہی نہ کر سکتا۔ لیکن معلوم نہیں کہ اس کتاب کی روح میں وہ کیا
خصوصیت ہے۔ جس نے میرے علاوہ کئی اصحاب کے دل میں یہ تحریک پیدا
کی کہ اس کا ترجمہ نظم میں کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی منظوم ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں
ہو سکتا۔ لہذا دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں ایک یہ ہے کہ ترجمہ اس طرح کیا جائے
جسطرح فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا۔ فٹز جیرالڈ نے الفاظ سے
قطع نظر کر کے فقط روح کو لے کر انگریزی قالب میں ڈھال لیا ہے۔ گیتا کے
اس قسم کے آزاد ترجمے بھی کئے گئے ہیں۔ اور آئندہ بھی بعض نغز گو شاعر اپنا شوق
آزادی کے ساتھ پورا کریں گے۔ اگر میں بھی چاہتا تو یہی راستہ اختیار کیا تھا
لیکن بعض وجوہ سے طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا۔ ایک عظیم الشان الہامی تعلیم
کے ساتھ یہ آزادی کچھ گستاخی بھی معلوم ہوئی۔ ناچار دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔
جو پل صراط کی طرح باریک اور دشوار گذار ہے۔ کہ شعر کی شعریت بھی سوخت نہ

ہونے پائے اور اصل مضمون کا ایک ذرہ بھر زائل نہ ہو۔ بیت کے دو مصرعے ترازوں کے دو پلڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وزن پورا کرنے کیلئے کچھ الفاظ ادھر اُدھر گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں۔ لیکن تولنے والے کا فرض یہ ہے۔ کہ جس جنس گرانبہا کو تولنا مقصود ہے۔ اس کا کوئی حصہ بن تلے نہ رہے سونے کو بہت کم مایہ چیزوں کے ساتھ تولا جاتا ہے۔ اس میں سونے کی کوئی تحقیر نہیں ہوتی۔ بقول عارف رومی ؎ در ترازو جَو رفیق زر شد است۔

بھگوت گیتا کے سونے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے میں میرے الفاظ کے جَو بھی شریک ہیں۔ لیکن اصل کے ساتھ ملا کر اس ترجمے کو پڑھنے والے کو اس کا اندازہ ہو جائیگا۔ کہ جو الفاظ میں نے اپنی طرف سے ڈالے ہیں۔ وہ محض بغرض وزن اور برائے بیت نہیں بلکہ اکثر جگہوں پر ان کا مقصد تشریحی ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے۔ کہ ترجمہ درست ہونے کے ساتھ ساتھ تشریح اور شعریت سے ہم آغوش رہے۔

میں اس تمہید میں گیتا کی تعلیم پر قلم اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اس کے اندر عرفان کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔ 'توحید کا بلند ترین تصور'۔ روح انسانی کا روحِ کل سے واسطہ'۔ زندگی اور موت کا [illegible] جسم اور روح کا تعلق'۔ علم اور عمل کی باہمی نسبت' جذبات اور عقل کا رشتہ'۔ صلح اور جنگ کا فلسفہ'۔ غرضیکہ حیات و ماورائے حیات کا شاید ہی کوئی اساسی مسئلہ ایسا ہو جو اس کے اندر موجود نہیں گیتا کا بنیادی نظریہ قرآن کریم اور تصوف اسلامی کے نظریہ سے بہت قریب ہے ہندوؤں

کے شاستروں میں یہی ایک کتاب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو دین قدیم کی اصلی وحدت سے آشنا کر سکتی ہے۔ از روئے اسلام توحید اصل دین ہے۔ کائنات کی وحدت اور انسان کی وحدت اس سے بطور نتیجہ حاصل ہوتی ہیں۔ علم بھی کثرت میں وحدت کی تلاش کا نام ہے —
اور اخلاق بھی کثرت اور تضاد میں وحدت کی کوشش ہے عشق بھی وحدت کے جذباتی پہلو کا نام ہے۔ اگر یہ وحدت کی روح کسی فرد یا قوم کے علم و عمل میں سرائت کر جائے تو جنگِ اضداد آشتی میں تبدیل ہو جائے۔ گیتا کی تعلیم میں تمام وہ عناصر موجود ہیں جو زندگی کے اہم مسائل کی عقدہ کشائی میں مدد دیتے ہیں۔ گیتا کا مردِ عارف یا مردِ کامل کا تصور بہترین انسان، یا جدید اصطلاح میں فوق الانسان کا تصور ہے بعض لوگ اس کو بے حد بلند ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل سمجھینگے۔ لیکن زندگی کے تمام حقیقی نصب العین اسی انداز کے ہیں۔

۵ گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما۔ گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزو ست

گیتا کے مردِ عارف کا مختصر خاکا یہ ہے کہ وہ مردِ موحد ہے۔ اور اس کا قائل ہے کہ لا الٰہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ مرد کامل اپنی خودی کو پاکیزہ منزّہ اور بلند کر کے الوہیت سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ مرد کامل بت پرست اور دیوتا پرست نہیں ہو سکتا۔ جو شخص جیسا ہوتا ہے ویسا ہی اس کا معبود بھی ہوتا ہے اور اس کے بالعکس بھی صحیح ہے۔ کہ انسان جس معبود کی پوجا کرتا ہے۔ وہ خود بھی

وہی ہوتا جاتا ہے ۔ فیضی کے ترجمے میں ایک نہایت عمدہ شعر ہے ؎

من از برسہ عالم جدا گشتہ ام ۔ تہی گشتہ از خود خدا گشتہ ام ۔

یہی تعلیم طریقت اور معرفت کا نچوڑ ہے ۔

عمل اور عبادت کی نسبت بھی گیتا کی تعلیم بہت بلند ہے ۔ زندگی عمل ہے ۔ اور بہترین عمل بے غرض عمل نشکام کرم ہے جزاء وسزا کے خیال سے جو عمل کیا جاتا ہے وہ حسب قواعد فطرت نتائج تو پیدا کرتا ہے ۔ لیکن وہ نتائج انسان کو خدا سے واصل نہیں کر سکتے ۔ یہ وہی خیال ہے جس کو مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ۔

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔ دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

رابعہ صوفیہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا کٹورا لئے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک کٹورے میں جلتی ہوئی آگ لئے ہوئے بازار میں سے گذر رہی تھی ۔ لوگوں نے اس کا مقصد دریافت کیا ۔ تو جواب دیا کہ اس پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے جا رہی ہوں ۔ اور اس آگ سے جنت کو جلانا چاہتی ہوں تاکہ لوگ جزا وسزا کے خیال سے عمل نہ کریں اور جو کچھ کریں تزکیہ نفس کے لئے اور خالص خدا کے لئے کریں ۔ عارف کامل عمل اور عبادت میں تنگ نظر یں نہیں بلکہ رواداری برتتا ہے ۔ خدا کی طرف جانے کے بہت سے راستے ہیں ۔ اپنے حالات اور فطرت کے لحاظ سے جو راستہ جس کے لئے مقدر ہے ۔ وہ اس پر چلے تو بہتر ہے ۔

اس معاملے میں نقالی کام نہیں دے سکتی مرد کامل کی نظر میں بھی وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس کو گیان حاصل ہوتا ہے تو وہ تمام مخلوقات کی مساوات کا قائل ہو جاتا ہے ذات پات کی تقسیم اس کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ غیر کو غیر نہ سمجھنا اور دشمن کی بھی بھلائی چاہنا۔ یہ اخلاق اور روحانیت کے بلند مقامات ہیں۔ اور جب تک کسی کی خودی خدا کے رنگ میں نہ رنگی جائے۔ وہ ان بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی ان حقیقتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور دشمن سے محبت کرنا اس کو ایک ناقابل عمل اور لغو خیال معلوم ہوتا ہے۔

موجودہ فتنہ و فساد اور سیاسی و معاشی کشمکش کے زمانے میں اس تعلیم کی انسانوں کو بے حد ضرورت ہے۔ اگر مختلف مذاہب کو ماننے والے دین کی اس اصلی روح سے متاثر ہوں تو مذہب انسان کے لئے فساد کا باعث ہونے کی بجائے صلح عام کا سرچشمہ بن جائے۔

هُوالحق

ہری اوم تت ست

شریمد بھگوت گیتا

پہلا ادھیائے

دھرت راشٹر نے پوچھا

کوروکشیتر میں آئے جب بہر جنگ — وہاں تھا لڑائی کا کیا رنگ ڈھنگ

مرے پوتوں اور پانڈوؤں نے وہاں — کیا جو کچھ اُس کو تو کردے بیاں

سنجے نے کہا

صف آرا تھا جب لشکر پانڈواں — اُٹھا دریودھن راجۂ کوراں

گرو سے کہا دیکھ آچاریہ — ہیں آمادۂ جنگ کیا آریہ

کھڑی پانڈوؤں کی ہیں فوجیں تمام — یہ یودھ دروپد کا ہے انتظام

بہادر ہیں یہ ہفت اقلیم کے — برابر ہیں یہ ارجن اور بھیم کے

لڑائی میں کیا جوش سے پُر ہیں یہ	لڑی میں پروئے ہوئے دُر ہیں یہ

ہمارے بھی ساتھی ہیں کیسے جَری	بہُت جنکی دُشوار ہے ہمسری

ہیں آپ اور بھیشم کرپ اور کرن	بدن اِن کے پولاد و آہن شکن

اِدھر میر بھیشم سا سالار ہے	ہمارے عساکر کا سردار ہے

اُدھر پانڈوؤں کا ہے سالار بھیم	جسے دیکھ کر موت کو بھی ہو بیم

ہر اک طرح کے اِنکے ہتھیار ہیں	یہ سب جان دینے کو تیار ہیں

یہ ماہر ہیں جنگ آزما جنگ جُو	بڑے تیز پیکار اور تُند خُو

نہیں اُن سے ہیٹے شجاعت میں ہم	مگر اپنی فوجیں ہیں گنتی میں کم

ہے واجب سب سکے نگہبان ہوں	حفاظت میں بھیشم کی قُربان ہوں

بجا سنکھ بھیشم کا اِس زور سے | کہ رن تھرتھرا اُٹھا اُس شور سے
بھنکے سنکھ اور ڈھول بجنے لگے | ببر شیر گویا گرجنے لگے
اُٹھا شور ہیکار ہر ساز سے | فضا گونج اُٹھی اُن کی آواز سے
وہ ہیبت تھی سارا جہاں ہل گیا | زمیں کانپ اٹھی آسماں ہل گیا
دھنش دھاریوں کی بھئیں فوجیں تمام | تلاطم در آغوش موجیں تمام
دہن موت کا ہر طرف باز تھا | کہ ہر سورما قادر انداز تھا
تھا اک رتھ میں ارجن کماں تھام کر | کھڑی تھی قضا آسماں تھام کر
سری کرشن کے ہاتھ میں تھی عناں | وہ رتھ میں جیسے بدن میں ہو جاں

ارجن نے سری کرشن سے کہا۔

ذرا رتھ کو اے جانِ جاں روک لے | دو افواج کے درمیاں روک لے

کہ اعدا کو دیکھوں ذرا غور سے — ہیں آمادۂ جنگ کس طور سے

میں اِن کو ذرا اِک نظر دیکھ لوں — نگاہوں سے اُڑتے شرر دیکھ لوں

جو دیکھا تو نظارہ تھا اِک عجیب — کہ دشمن تھے سارے عزیز و قریب

وہاں پر تھے اپنے ہی سب روبرو — کوئی تھا بزرگ اور کوئی گرو

طبیعت پہ طاری ہُوا رنج و غم — بہادر کھڑا تھا سراپا الم

شجاعت وہاں کالعدم ہو گئی — زباں خشک اور آنکھ نم ہو گئی

بدن پر کھڑے ہو گئے رونگٹے — یگانوں سے کِس طرح کوئی لڑے

لگاؤ ہی جن سے ہو کیوں اُن سے لاگ — مرے تن بدن میں سُلگتی ہے آگ

سب اپنے عزیزوں کا ہے سامنا — ہے مشکل کماں ہاتھ میں تھامنا

حکومت ہی کیا گر وہی چل بسے	کہ جیتا ہے انسان جن کے لئے

یہ فتح و حکومت یہ سور و سُرور	ہیں بیکار خویش و اقارب سے دُور

گرُو ہے کوئی تو کوئی باپ ہے	کروں قتل اِن کو تو یہ پاپ ہے

میں کونین لے کر نہ ایسا کروں	انہیں مار کر کس کی خاطر جیوں

کوئی دست و پا اپنے کیوں کاٹ لے	کوئی جان کر زہر کیوں چاٹ لے

اِنہیں گر نہیں اپنے کنبے کا پاس	یہ دیوانے کھو بیٹھے عقل و حواس

تو میں اپنے دامن کو کیوں تر کروں	یہ بہتر ہے اس سے کہ خود ہی مروں

زنا خانہ جنگی سے ہوتا ہے عام	جہاں میں یونہی پھیلتا ہے حرام

نہیں رہتی باقی حیا اور شرم	نہ رکھتا ہے کچھ فرق دھرم اور اَدھرم

جو کھو دے کوئی خاندانی شعار　　ابد تک پھر اُس کا ٹھکانا ہے نار

لڑے جو لڑائی یہ ، نادان ہے　　یہ سب ورن سنکر کا سامان ہے

ہے قتلِ عزیزاں گناہ عظیم　　جو ایسا کرے ہے وہ بیشک لئیم

کریں وار گر وہ اُٹھاؤں نہ ہاتھ　　بچانے کو اپنے ہلاؤں نہ ہاتھ

کماں چھوٹی اور ہاتھ ڈھیلا ہُوا

غم و رنج سے رنگ پیلا ہُوا

دُوسرا ادھیائے

ترحم سے ارجن ہُوا بے قرار　　ہوئی مضطرب غم سے جان نزار

سری کرشن بولے سُن اے ارجمند　　طبیعت کو رکھ خوف و غم سے بلند

بہادر کا دل چاہئیے بے ہراس　　مگر تجھ پہ طاری ہے حرمان و یاس

نہیں بھاگتے آریوں کے سپُوت　　ہے پیکار حق شیوۂ راجپوت

کہا اس پہ ارجن نے اے رہنما　　ذرا اس مُعمّہ کا حل کچھ بتا

مقابل درونا و بھیشم سے پیر　　چلیں اُن بزرگوں پہ کس طرح تیر

بزرگوں پہ ہے ہاتھ اٹھانا حرام　　پیئوں کیسے خُونِ اقارب کا جام

بجائیکہ گردن پہ نُوں اُن کا خُون
ہے بہتر کہ در در گدائی کروں

جو میدان ہاریں تو ذِلّت کا کام
جو جیتیں تو بعد اُس کے جینا حرام

مِلے گر مجھے دیوتاؤں کا راج
ہوا کا شُن سے مجھکو بھی حاصل خراج

جو سُلطانی مہر و اختر سے مِلے
شہنشاہی ہفت کِشور ملے

یہ دولت یہ نصُرت یہ سب برگ و ساز
نہیں ہے علاج غم جاں گداز

مرا ہاتھ شل اور پا لنگ ہے
کہ جنگ اِس طرح باعثِ ننگ ہے

نہیں ہے مرے تن میں تاب و تواں
یقیں دِل سے غائب ہے غالب گماں

لڑائی کی فوجیں ہیں آراستہ
بتا ہے کدھر دھرم کا راستہ

کہا کرشن نے مسکرا کر کہ سن ہے دُر دانہ لبریز حکمت سخن

جو ہے واقف راز بود و عدم حوادث سے اُس کو نہ خوف اور نہ غم

نہ رنج ہے سر بسر بے محل کہ آتا ہے حکمت میں اس سے خلل

ہے بالائے تشویش جانِ حکیم نہ اندوہ و غم اور نہ اُمید و بیم

جو میرا ترا جوہر ذات ہے وہ جوہر ہے جس سے اجل مات ہے

ہر اک روح کی ذات ہی سرمدی کہ ہے روح اک پرتوِ ایزدی

ازل سے ہے جو جاں کہ موجود ہے فنا ایسی ہستی سے مفقود ہے

یہ طفلی، شباب اور پیری کے دور حیاتِ بدن کے بدلتے ہیں طور

تغیر بدن میں ہی قائم ہے جاں بدن سب کے فانی ہیں دائم ہے جاں

یہ سردی یہ گرمی سرور اور غم　　کوائف بدلتے ہیں یاں دمبدم

ظواہر کا آئین ہے انقلاب　　کبھی موج ہے اور کبھی ہے حباب

مگر روح فارغ ہے تغییر سے　　بری ہی ہر اک نقص و تقصیر سے

جو تجھ کو حیات قدم چاہیئے　　تغیر کا ہرگز نہ غم چاہیئے

جو فانی ہی وُہ ذات سے ہے جُدا　　جو باقی ہی فطرت ہے اُس کی بقا

ہے محدود جسم اور جاں بے کنار　　ہے جاں سب میں ایک اور بدن بیشمار

یہ جانیں نہ قاتل نہ مقتول ہیں　　جو ایسا سمجھتے ہیں. مجہول ہیں

حقیقت ہے جو آفریدہ نہیں　　وہ دستِ قضا سے بریدہ نہیں

ہر اک روح ہے نفخِ روحِ ازل　　نہ اس میں تغیر نہ اس میں بدل

یہ جوہر نہ ہرگز گھٹے اور بڑھے　　نہ کاٹے چھٹے اور نہ اُترے چڑھے

جو اس راز سے آشنا ہو گیا
وہ عارف سراپا بقا ہو گیا

بدن کی یہ سب صورتیں ہیں لباس
بدلتی نہیں جن سے جاں کی اساس

اگر جامہ ناپاک ہو یا کہن
ہے بہتر اتر جائے وہ پیرہن

جو آلودہ ہو پیرہن پھینک دے
اسی طرح جاں یہ بدن پھینک دے

ہے جاں اپنی اک موج نورِ قدیم
نہیں ہوتی تیغ و تبر سے دو نیم

کسی آگ میں پڑ کے جلتی نہیں
کسی آب میں گھُلتی گلتی نہیں

نہیں اس کو چھوتا ہے تارِ نظر
نہ گرمی سے خشک اور نہ پانی سے تر

یہ باطن ہی ظاہر کی حد سے پرے
ہر اک خیر و شر نیک و بد سے پرے

نہ ادراک نے راہ پائی وہاں
نہ وہم و گماں کی رسائی وہاں

سمجھ لے اگر اس طرح ارجمند　　تو ہو ہر طرح خوف و غم سے بلند

حقیقت بھی ہو گر یہ موت و حیات　　غم و رنج ہے پھر بھی بیکار بات

جو پیدا ہوا اس کا مرنا ضرور　　ہے سبکو اسی گھاٹ اترنا ضرور

گیا آج جو یاں سے کل آئے گا　　وہ صورت بدل کر نکل آئے گا

ہے گر مرنے جینے کا قانون اٹل　　تو پھر اس پہ افسوس ہے بے محل

یہ تخریب و تعمیر مخلوق ہے　　ازل سے یہ تقدیرِ مخلوق ہے

عدم سے ابھرتے ہیں سارے وجود　　ہے دیرینہ آئینِ بود و نبود

ابھرتے، سنورتے، گذرتے ہیں سب　　عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب

اٹھاتی ہے سر جیسے دریا سے موج　　گھڑی بھر کا ہے سب غرور اور اوج

جو عارف ہی وہ اس سے گھبرائے کیوں　جو عاقل ہی وہ مفت غم کھائے کیوں

یہ جاں ہے بڑی حیرت انگیز چیز　مگر کون رکھتا ہے عقل و تمیز

جو ہے جوہر جانِ عالی تبار　نہیں اس پہ چلتا کسی کا بھی وار

جو چھتری ہے حق کا سپاہی ہے وہ　لڑائی میں تیغِ الٰہی ہے وُہ

بہادر ہے تو دھرم کی لاج رکھ　صداقت کا تو سر پہ اک تاج رکھ

غنیمت سمجھ اس کو اے با ادب　کھلا بابِ جنّت بغیر طلب

گیا تو اگر دھرم کو چھوڑ کر　فرائض سی چھتری کے مُنہ موڑ کر

یونہی رائیگاں کھوئیگا اپنی ساکھ　گُناہوں سے ہوگا عمل تیرا راکھ

تو کیوں ایسا ننگِ زمانہ بنے　کہ بے ہمتی میں فسانہ بنے

شجاعت سورگ اور ذلّت سے نرگ　سمجھ لے کہ ذلّت سی بہتر ہے مرگ

کہیگا یہ ہر ایک سینا پتی کہ کی تو نے چھتری کی بے حرمتی

گیا خوف سے اس طرح رن سے بھاگ کہ بھاگے دُھواں چھوڑ کر جیسے آگ

جو کہتے تجھے عزت کے قابل ہے تو وہی کہہ اُٹھینگے کہ بُزدل ہے تو

کشادہ رہے گی زبانِ عدو زمانے میں تو ہوگا بے آبرو

وہ جنگ آزما کیسا خوش بخت ہے کہ جس کے اِدھر خلد اُدھر تخت ہے

یہ انعام ہی تیری تقدیر میں کہ جنّت ہے آغوشِ شمشیر میں

ارادے کو مضبوط کر اور اُٹھ بہادر ہے گر تو نہ ڈر اور اُٹھ

حساب و کتاب و زیان و مفاد چٹانوں کو کیا خدشۂ ابر و باد

ہے اجب خیالاتِ رنج و سرور ہوں حق کوش انساں کی ہمت سے دُور

جہاں میں اگر تجھکو سچ کی ہے پربت برابر ہے پھر تجھ کو ہار اور جیت

مُجاہد ہے ہر اک گنہ سے بری — یہی دین ہے شایانِ مردِ جری

جو دیکھے حقیقت کی تو آنکھ سے — مطابق ہی تعلیم یہ سانکھ سے

سناؤں گا اب تم کو اسرارِ یوگ — کہ سب دور ہوں جس سے روگ اور بیوگ

نہیں اس میں کوشش کوئی رائگاں — نہ ہی اس میں کوئی خرابی نہاں

ہے تھوڑے میں بھی فائدہ بے شمار — کہ کرتا ہے ہر خوف دل سے فرار

ہے عرفان کی سوئے وحدت نظر — ہے اک اصل سے زندگی کا شجر

جہاں پر ہے کثرت، جہاں ہے دوئی — تمنا کی شاخیں ہیں اُلجھی ہوئی

ہے ژولیدہ مردِ پریشاں خیال — بچھائے ہے دل آرزوؤں کا جال

پھنسا ہے وہ الفاظ کے دام میں — وہ ہے پابگل رُوپ اور نام میں

ہے ویدوں کے منتر میں جکڑا ہوا — لکیروں کے جادو میں پکڑا ہوا

طلبگارِ اثمارِ باغِ بہشت سمجھتا ہی دُنیا کو عقبیٰ کی کشت

جو رسمی عبادت میں ہے انہماک نہیں ہی غرض سی عمل اُس کا پاک

وہ لذّت سے ہے طالبِ زندگی اِسی کے لئے اُس کی ہے بندگی

عمل کر رہا ہے کہ لذّت ملے بہت اقتدار اور قوّت ملے

خیالات بکھرے کہیں سی کہیں طبیعت کبھی اُس کی یکسو نہیں

صفات ثلاثہ ہیں مضمونِ وید مگر اور ہے کچھ حقیقت کا بھید

سہ گونہ گنوں سے ہو تو ماورا اگر چاہتا ہے مقامِ بقا

جہانِ عِلل عالمِ اضداد کا یہاں ساتھ ہے شاد و ناشاد کا

یہ وحدت کا عالم ہی اس سے بلند وُہ ہے عالمِ پاک اے ہوشمند

جو عالم ہے لبریز توحید سے وہاں تک رسائی ہے تجرید سے

برہمن کو ہے گیان حاصل اگر جمی بس ہی وحدت پہ اُس کی نظر

جو وحدت کے دریا میں غرقاب ہے اسے وید اِک جوئے پایاب ہے

عمل سے تمنا نہ رکھ اُس کا پھل کہ ہے آرزو اجر کی اِک خلل

عمل سے مکافات کی آرزو ہے لذات و آفات کی آرزو

اِسی طرح آفت ہے ترکِ عمل وہ ہے اک طرح زندگی میں اجل

عمل ہو ترا گر سپردِ خدا تو نفع و ضرر سے نہ ہو مدعا

عمل میں جو محوِ خدا ہو گیا عمل اُس کا بے مدعا ہو گیا

تھپیڑے نہ کھائے تمنا کے گر نہ ہو نفس تیرا اِدھر اور اُدھر

جو یوں محو ذات الٰہی رہے　　کہ جس طرح دریا میں ماہی رہے

وہ عارف جو یوں وصل حق میں ہے مست　　ثمر خواہ کا اُس سے رُتبہ ہے پست

ہے عقل الٰہی عمل سے بلند　　نہ پہنچے وہاں خیر و شر کی کمند

جو یوگا کی راہوں میں خورسند ہے　　عمل میں وہی بس ہُنرمند ہے

تناسخ سے پاتے وہی ہیں نجات　　جنہوں نے کیا نفس کو محو ذات

نکل آئے جو وہم کے دام سے　　وہ بالا ہیں الفاظِ الہام سے

اگر نفس مضطر ہے آیات سے　　سُنی اور سُنائی ہوئی بات سے

اُسے وحدت حق میں کر غرق تو　　مٹا دے من و تو کا یوں فرق تو

ہے تغیرِ احوال سے عقل مات　　ہے کثرت تغیر تو وحدت ثبات

بہر حال اگر نفس ہو مطمئن　　برابر ہوں غم اور شادی کے دن

جو دل اپنی حالت میں ہے استوار نہ ہے کچھ گوارا نہ ہے ناگوار

الگ ہو جو ہیجانِ جذبات سے بری خوف و غصہ کے آفات سے

حوادث سے جو بے اثر ہو گیا سمجھ لو کہ وہ باخبر ہو گیا

یہی شان ہے معرفت کی دلیل دلوں میں توازن کی ہے یہ سبیل

اگر کوئی دیتا ہے کچھوے کو چھیڑ وہ لیتا ہے سب ہاتھ پاؤں سکیڑ

تو یوں حس سے اپنی عناں کھینچ لے عیاں سے بسوئے نہاں کھینچ لے

گر انسان کرتا ہے اشیا کو ترک نہیں کرتا اُن کی تمنا کو ترک

یہ مانا کہ سارا جہاں ہٹ گیا مگر آرزو سے کہاں ہٹ گیا

جو زاہد کہ غاروں میں روپوش ہے وہ محروم خواب و خور و نوش ہے

یہ ہے آرزوئیں دبائے ہوئے — بہت حسرتیں ہیں چھپائے ہوئے

اگر اس کو دیدارِ حق ہو نصیب — مٹا دے تمنا کو وصلِ حبیب

ہے گر کشتیٔ جاں میں سامانِ حس — ڈبو دیگا ناؤ کو طوفانِ حس

ہے گر ساتھ جذبات کا جوش بھی — لڑھکتی ہے عقلِ نکو کوشش بھی

عمل سے اگر حق ہی مقصود ہو — تو سب اضطراب اس سے مفقود ہو

ہے بس ضبطِ حس میں سکوں عقل کا — تمنا سے ہوتا ہے خوں عقل کا

جو اشیا کی جانب لگاتا ہے من — علائق کے بندھن کو ہے یہ رسن

ابھرتی تعلق سے ہے آرزو — ہے ہر دم کسی چیز کی جستجو

نہ پوری ہو گر آرزو تو غضب — وہ ہوگا گرفتارِ رنج و تعب

غم و غصہ سے حافظہ ہو خراب — اسی سے ہے پھر عقل میں پیچ و تاب

جہاں عقل میں اس طرح ہو کمی
تو سمجھو کہ بس ختم ہے آدمی

جو قابو میں رکھتا ہے اپنے حواس
تمنا بھٹکتی نہیں اُس کے پاس

اسی جان کا مسکن ہے دارالسلام
کہ جس میں نہیں ہے تمنائے خام

جہاں پر نہیں ہے کوئی درد و کرب
نہیں دل کو لگتی وہاں کوئی ضرب

اگر دل ہے قائم تو قائم ہے عقل
کہ دل ہی سے وابستہ دائم ہے عقل

ہے دل مضطرب تو پریشاں ہی ہوش
بہت عقل کش ہے طبیعت کا جوش

جو جذبات پر اپنے قابو نہیں
کسی حال میں قلب یکسو نہیں

یہ جس عقل کو مانتی کچھ نہیں
ہے دل مضطرب شانتی کچھ نہیں

نہ ہو شانتی تو مسرت کہاں
مسرت نہیں تو سعادت کہاں

پراگندہ دل کی وہی ہے مثال
جو طوفاں میں ہوتا ہے کشتی کا حال

اگر تیرے سینہ میں ہیجان ہے — تو منجدھار ہی اور طوفان ہے

جو رکھتا ہے قابو میں اپنے حواس — قوی ہی بہت اسکے دل کی اساس

خودی میں اگر واصلِ ذات ہے — جو دن اور کا اُسکی وُہ رات ہے

جو جگ جاگتا ہے تو سوتا ہے وہ — جہاں سوئے بیدار ہوتا ہے وہ

خودی میں ہوئیں آرزوئیں غروب — گئیں ندیاں سب سمندر میں ڈوب

تمنا کی کثرت ہے وحدت میں گم — پریشانیاں ہیں سلامت میں گم

یہی ہے سکون و سکوتِ ازل — نہیں جس میں ہوتا ہے ردّ و بدل

جو مرتے ہوئے یوں فنا ہو گیا — وہ عارف سراپا بقا ہو گیا

تیسرا ادھیائے

کیا اس پہ ارجن نے پھر یہ سوال
کہ اے مردِ خوشحال و شیریں مقال

اگر علم ہے یُوں عمل سے بلند
عمل کیوں کرے پھر کوئی ہوشمند

عمل بھی پھر ایسا کہ خوں ریز ہے
جنوں خیز ہے فتنہ انگیز ہے

مری عقل حیراں ہے اِس قول سے
طبیعت پریشاں ہے اِس قول سے

رہِ راست کیا ہے بتا دے مجھے
سلامت روی کا پتا دے مجھے

کہا کرشن نے سن کے راہیں ہیں دو
نظرگاہ اک اور نگاہیں ہیں دو

حقیقت کو پاتی ہے جب دل کی آنکھ
تو وُہ معرفت ہے بہ اندازِ سانکھ

پر نگرہ یوگ رستہ ہے اعمال کا
طریقہ ہے احوال و اشغال کا

نہیں ملتی ترکِ عمل سے نجات   نہ حاصل ہوں اس سے کمالات ذات

عمل سے نہ چھوٹا کوئی ایک پل   عمل زندگی، زندگی ہے عمل

ہر اک شئے ہے فطرت میں مصروف کار   کہ اِس جبر میں کچھ نہیں اختیار

کچھ ایسے بھی زاہد ہیں بیہودہ کوش   نہیں اُنکے اعضا میں جنبش نہ جوش

عمل کو ہیں بیٹھے دبائے ہوئے   پہ محسوس سے لَو لگائے ہوئے

یہ زہّادِ احمق، ریا کار ہیں   سراسر عبث ان کے کردار ہیں

ہے بیتاب نفس اور ساکن بدن   نہیں جانتے کچھ یہ یوگی کا فن

مگر دستِ صادق ہے مصروف کار   طبیعت کو حاصل ہے صبر و قرار

تصرف میں ہیں اُسکے سارے حواس   پھٹکتا نہیں انتشار اُسکے پاس

اگرچہ ہیں سب دست و پا کام میں   نہیں ہے تعلق کے وہ دام میں

ہے سیدھا یہی دھرم کا راستہ　　ادا فرض اپنا کرو بے ریا

عمل ترک کر دے اگر مردِ خام　　بدن کا بھی ممکن نہیں ہے قیام

جمود اور سکون سے ہے بہتر عمل　　نہ ہو جس میں کچھ آرزو سے خلل

یہاں جو بھی ہے، اور جس حال میں　　بندھا ہے وہ زنجیرِ اعمال میں

مگر وہ عمل جو ہے یگ کیلئے　　وہ لقمہ نہیں نفسِ سگ کیلئے

برہما نے خلقت کو پیدا کیا　　تو ساتھ اُسکے یگ بھی ہویدا کیا

کہا یہ کہ یگ سے جہاں میں بڑھو　　یہ ہے کام دھینو جو چاہو سو، لو

چڑھاوا اگر دیوتا پر چڑھے　　تو انساں کا بھی رزق اُس سے بڑھے

اگر دیوتاؤں کو رکھو گے شاد　　وہ پوری کرینگے تمہاری مراد

وہ دیتے بھی ہیں اور دلاتے بھی ہیں　　وہ کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی ہیں

جو قربانیوں میں بخیلی کرے — وہ چوروں کی صورت رذیلی کرے

پس انداز یگیہ کا کھاؤ حلال — پھنسائے نہ تمکو گناہوں کا جال

مگر جو غذا خود غرض سے لپیٹ — کہ بھرتا رہے اُس سے اپنا ہی پیٹ

سمجھ لو وہ کھانا سراسر ہے پاپ — جہنم کی آگ اور جہنم کی بھاپ

غذا سے سہارا ہے مخلوق کا — اسی سے گذارا ہے مخلوق کا

غذا ساری پیدا ہے برسات سے — جو بھرتی ہے دُنیا کو بہتات سے

ہے بارش کا قربانیوں سے وجود — عمل سے ہے قُربانیوں کی نمود

عمل کا ہے مبدا برہما کی ذات — اسی سے ہی سب کاروبارِ حیات

برہما ہے جس کا ظہورِ جمال — وہ مصدر ہے اِک ہستئ لازوال

وہ اِک ذات سرمد ازل کا ہے نور — سدا یگیہ میں ہے اُس کا ظہور

اسی طرح چلتا ہے دورِ حیات — یہ ہے دورِ خونِ رگِ کائنات

اسی طرح گردش میں ہے زندگی — اسی سے ہے جانوں میں تابندگی

جو بچتا ہے اس سے وہ بیکار ہے — گرفتارِ لذّت گنہگار ہے

مگر ہے حقیقت میں وُہ شخص خوب — جو اپنی حقیقت میں جاتا ہے ڈوب

رضا جوئے حق ہے جو بے چون و چند — وہ ہوتا ہے سطحِ عمل سے بلند

غرض اس کو کیا ہے کسی کام سے — بری ہی وہ غفلت کے الزام سے

نہ وابستہ اُس کی کسی سے طلب — کہ ہیں بے غرض اس کے اعمال سب

ہے ہر کام اس کا خُدا کی رضا — خود ہی اُس کی ہے محوِ ذاتِ خُدا

جنک اور کئی اولیائے خدا — عمل سے ہی پائی انھوں نے بقا

عمل تم بھی ایسا کرو میری جاں — ہو جس میں صلاح و فلاحِ جہاں

جو ہیں سر برآوردہ لوگوں کے کام — انہیں کی ہیں تقلید کرتے عوام

مجھے دیکھ میں رب سے ہوں بے نیاز — نہیں میرے دل میں ذرا حرص و آز

کسی شے کی مجھ کو نہیں جستجو — ہوں بے مدعا اور بے آرزو

میں اس پر بھی رہتا ہوں مصروف کار — ہے دونو جہاں کا اِسی پر مدار

میں برتوں اگر غفلت اور کاہلی — تو سب خلق اسکی کرے پیروی

اٹھائے نہ دُنیا میں کوئی قدم — عدم ہی عدم ہو عدم ہی عدم

ہو اک پل میں دُنیا کا برہم نظام — نہ حفظِ مراتب نہ حفظِ مقام

ہیں نادان کرتے تمنّا سے کام — تعلق ہے اہلِ صفا پر حرام

نہ خواہش نہ آمیزشِ سود ہو — ترا کام عالم کی بہبود ہو

تمنا سے گر کام جاہل کرے		نہ دانا کوئی اس کو بد دل کرے

عمل یُوں کرے عارفِ باخدا		طبیعت میں تسلیم ہو اور رضا

عمل کو وہ ایسے سنوارا کرے		کہ جاہل بھی اُس کو گوارا کرے

ہیں قدرت کے اندر سہ گونہ صفات		عمل جن کا ہے مظہر کائنات

خودی میں فریب اہنکار ہے		سمجھتی ہے خود مصدرِ کار ہے

جو مطلق کو پہنچا ہے تجرید سے		وہ ہے لذّت اندوز توحید سے

یہ فطرت ہے اِک کارگاہِ صفات		منزّہ مبرّا احد کی ہے ذات

صفات اور وظائف میں جو قید ہے		وُہ صیّادِ تزویر کا صید ہے

نہیں چاہیئے کامل اِنسان کو		کہ ڈالے تردّد میں نادان کو

خودی سے عمل ہو اگر تیرا پاک — نہ اُمید اُجرت نہ نقصان کا باک

نہ حرص و ہوا اور نہ غیض و غضب — نہ امید و بیم اور نہ رنج و تعب

رضا اور تسلیم شیوہ بنا — ہر اک کام کو کر سپرد خدا

طبیعت میں پیدا یہی رنگ کر — مجاہد خدا کا ہو اور جنگ کر

جسے میری تعلیم پر ہے یقیں — نہیں جو کوئی عیب جو نکتہ چیں

نہیں جس کے ایمان میں کچھ خلل — اُسی کے موافق ہے جس کا عمل

وہ کرموں کے بندھن سے آزاد ہے — حقیقت کی دُنیا میں آباد ہے

جو تعلیمِ یزداں کا قائل نہیں — عمل اُس پہ کرنے پہ مائل نہیں

وہ نادان دھوکا ہے کھائے ہوئے　　گناہوں کی گٹھری اُٹھائے ہوئے

نہ عرفان و ایمان نہ علم و عمل　　گریگا جہنم میں وُہ سر کے بل

ہے عارف بھی یاں پر اسیرِ حدود　　کہ عائد ہیں فطرت کے اُس پر قیود

گرفتارِ فطرت ہے ہر جاندار　　نہیں اس سے ممکن گریز اور فرار

ہے محسوس اشیاء کا جس پر مدار　　گوارا ہے کوئی کوئی ناگوار

مگر یہ پسندیدہ و ناپسند　　ہے انکی حکومت سی جاں کو گزند

جہاں میں ہر اک کا ہی مخصوص دھرم　　نہیں اسکے ایفا سی عاقل کو شرم

مقرر ہیں سب کے مناسب مقام　　اسی سی ہے دنیا کا قائم نظام

سُن اے مرد دانا تو اپنی نبیڑ　　فرائض کو اوروں کے ہرگز نہ چھیڑ

فرائض میں غیروں کی تقلید و نقلی　　نہ ہے کارِ دیں یہ، نہ ہی کارِ عقل

مقرر ہے دنیا میں جو جس کا کام　　بُرا یا بھلا وہ کرے صبح و شام

ہے انساں کی اپنے ہی پیشے میں خیر　　کہ خطرہ سے خالی نہیں کارِ غیر

کیا اس پہ ارجن نے پھر یہ سوال　　بتا مجھ کو اے مرشدِ باکمال

ہے باطن میں کیا قوت بے پناہ　　جو کھینچے ہی انساں کو سوئے گناہ

جھجکتا ہوا اور سمٹتا ہوا　　چلا جا رہا ہے گھٹتا ہوا

کہا کرشن نے سُن حقیقت ہے یہ　　سمجھ لے کہ اصلی طریقت ہے یہ

ہے پوشیدہ جس میں گناہوں کا راز　　کبھی طیش ہے وہ کبھی حرص و آز

جو غیض و تمنا سے آلودہ ہے   عمل اس کا ہر ایک بیہودہ ہے

جہاں سوز کیا شعلۂ آز ہے   دہن حرص کا ہر گھڑی باز ہے

ہو آتش پہ جیسے دھوئیں کا غلاف   نظر جس سے آتا نہیں نور صاف

جب آئینہ ہوتا ہے محجوب زنگ   تو ہے تیرگی میں وہ اک تیرہ سنگ

جنیں جیسے جھلی میں لپٹا ہوا   اسی طرح من پر ہے پردہ پڑا

ہوس عقل کو ہے لپیٹے ہوئے   ہے اک چور دولت سمیٹے ہوئے

ہوس چشم بینا کو لیتی ہے ڈھانپ   یہی عقل کی آستیں کا ہے سانپ

یہی فرض اور بہتریں ہے عمل   کہ اس مار خونخوار کا سر کچل

اگرچہ ہیں اشیاء سے برتر حواس   مگر ذہن کی ہے قوی تر اساس

اگر دیکھئے چشمِ امعان سے تو ہے عقل بالا تر از ہاں سے

مگر رُوح ہے عقل سے بھی بلند نہیں جس پہ کوئی در راز بند

یہی رُوح اصلی ہے روحِ خدا ہے فہم اور حس سے ورا الورا

جو بچنا ہے دشمن کی ہر گھات سے تو کر دل کو وابستہ اس ذات سے

چوتھا ادھیائے

کیا پہلے جب میں نے یہ راز فاش | ہے جس کی ہر اک حق طلب کو تلاش

وِوسوان کو میں نے تعلیم دی | ہے جسمیں سراسر صداقت بھری

منو نے یہ سیکھا وِوسوان سے | منور کیا دل کو عرفان سے

سکھایا منو نے یہ اشواک کو | لیا اُس نے اِس گوہرِ پاک کو

بہت سے ہیں رویشس خو تاجور | ہوئے جو اسی یوگ سے بہرہ ور

یوں ہی ایک سے ایک کہتا رہا | یہ دریا اسی طرح بہتا رہا

یہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا | یہ دریا غلاظت سے بھرتا گیا

تجھے آج دیتا ہوں میں وہ سبق ازل سے لگی جس پہ ہے مُہرِ حق
تو اس علمِ یزداں کا حقدار ہے میرا پیارا ہے اور پرستار ہے

سُنا جب یہ ارجن نے پُوچھی یہ بات ذرا یہ بتا اے ستودہ صفات
دو سوان تو تجھ سے پہلے ہُوا یہ کیسے کہیں اس نے تجھ سے سُنا
نہ آیا سمجھ میں یہ ہے راز کیا ہے انجام کے بعد آغاز کیا

سری کرشن بولے کہ اے حق طلب بتاؤں تجھے کیا ہے "جب اور اَب"
کئی بار ہم تم ہویدا ہوئے کئی بار دُنیا میں پیدا ہوئے
مجھے اپنے ماضی کا سب ہوش ہے مگر تجھ کو سب کچھ فراموش ہے

مری ذات ہے گو جنم سے بری نمود اور بود و عدم سے بری

اگرچہ ہوں میں مالک کائنات نہیں زادہ و آفریدہ یہ ذات

یہ ہے میری مایہ کی قدرت کا کھیل مگر اس بدن سے نہیں میرا میل

بہت دھرم میں جب ہے پڑتا بگاڑ تو لے کر کسی ایک صورت کی آڑ

فلاحِ جہاں کو اترتا ہوں میں اور اصلاح کا کام کرتا ہوں میں

کہ ظلمت میں آکر اجالا کروں نکوکار کا بول بالا کروں

قوی مجھ سے ہوتی ہے بنیادِ دیں مٹاتا ہوں دنیا سے میں مکر و کیں

کئی بار اس طرح آیا گیا پلٹ کر میں دنیا کی کایا گیا

اترتا ہے کس طرح ظلمت میں نور ہے کس طرح ہوتا خدا کا ظہور

کس انداز کا ہے خدا کا عمل　　مقام اُس کا کیا اور کیا ہے محل

جو اس راز سے آشنا ہو گیا　　وُہ پیدائشوں سے رہا ہو گیا

وہ واپس ہُوا اصلِ ہستی میں پھر　　نہ آئیگا دُنیا کی پستی میں پھر

غم و غصہ و خوف و حزن و ملال　　بُرا جن سے ہوتا ہی انساں کا حال

اسی طرح کی آفتیں ہیں کئی　　جنہیں آتشِ معرفت کھا گئی

بہت مردِ دانا بہت مردِ نیک　　ہوے مل کے یُوں ذات واحد میں ایک

سوئے حق بہت سی ہیں راہیں درست　　مری سمت جو راہ چاہیں درست

ہے گرچہ جُدا سب کی طرزِ خرام　　سوئے بحر جاتے ہیں دریا تمام

کشادہ بُہت میرے ایوان ہیں　　ہر اک طرح کے میرے مہمان ہیں

جو دُنیا ہی ہیں طالبِ سُود ہیں بہت دیوتا ان کے معبود ہیں
وُہ پاتے ہیں دُنیا میں اپنی مراد گھڑی دو گھڑی دل کو کرتے ہیں شاد
یہ ہے کامیابی بہت مختصر بجھے جیسے اکدم چمک کر شرر
جو ذاتوں کی دُنیا میں تقسیم ہے مری پیدا کردہ وہ تنظیم ہے
صفت اور عمل کی یہ تفریق ہے مگر ساتھ ہر اک کے توفیق ہے

خدا کو نہیں بندشِ کار کچھ نہ چاہے عمل سے وُہ اثمار کچھ
ہُوا آشنا جو اِس آنند سے وُہ چھوٹا عمل کی جکڑ بند سے
یہی تھا ہمیشہ طریقِ سلف نجات اک گہر تھی عمل تھا صدف
عمل تجھ کو اے خوش گہر چاہیئے پہ بے آرزوئے ثمر چاہیئے

عمل وُہ جو چھوٹا ہُوا تیر ہو ۔ نہ ایسا عمل جو کہ زنجیر ہو

عجب ہے عمل اور ترکِ عمل ۔ کچھ آساں نہیں ایسی مشکل کا حل

یہاں مردِ دانا بھی حیران ہے ۔ کہ اس زیچ وخم میں پریشان ہے

سمجھنے میں اسکے ذرا سا ہی بل ۔ عمل ہے کج روی، اور ترکِ عمل

یہ کرنا نہ کرنا عجب زیچ ہے ۔ سمجھ آدمی کی یہاں ہیچ ہے

مگر مردِ عاقل جو ہے نکتہ بیں ۔ کرے یُوں کہ گویا کیا ہی نہیں

کہ ہے اُسکی حرکت سراپا سکوں ۔ نہیں ہے عمل ایسا کارِ زبُوں

عمل جس کا ہے ہر ہوس سے بری ۔ وہی ہے عمل کے قفس سے بَری

جہاں تیری کچھ آرزو ہی نہیں ۔ وہاں پر یہ سچ ہے کہ تو ہی نہیں

عمل میں ترے گر نہیں حرص و آز | خودی مٹ گئی ہے خدا کارساز
جو یوں نیست ہو کر ہوا حق میں ہست | برابر سمجھتا ہے فتح و شکست
نہ امیدِ لذت نہ خوفِ گزند | توکل کا ہے اس کو شیوہ پسند
بدن سے وہ مصروفِ اعمال ہے | مگر روح میں فارغ البال ہے
بری ہے حسد اور بیداد سے | وہ بالا ہے پیکارِ اضداد سے
جو پاتا ہے یوں معرفت کا مقام | تو قربانیاں ہیں تمام اُس کے کام
یہ سامانِ یگ آگ ہو یا غذا | اِدھر بھی خدا اور اُدھر بھی خدا
جس اگنی میں کرتی ہے یگ جانِ پاک | وہ اگنی بھی ہے نورِ یزدانِ پاک
جو شے ایسے نذرِ خدا ہو گئی | فنا میں سراپا بقا ہو گئی
نظر گاہِ عارف ہے بس ذاتِ رب | بنامِ خدا اندرِ آتش ہے سب

جو باطن کا اپنے نگہبان ہو تو احساس و محسوس قربان ہو

کہیں ترکِ دولت کہیں حبسِ دم طریقت کی راہیں ہیں سب بیش و کم

کسی کا ہے یگ ساز و سامان سے کسی کا ریاضت سے عرفان سے

ہے کوتاہ جن جوگیوں کی نظر چڑھاتے ہیں نذریں وُہ دیوتاؤں پر

غرض یہ ہی ہر کام ہر بات سے کہ انساں ہو آشنا ذات سے

ہے قربانیٔ نفس سب سے بلند کہ عرفان حاصل کرے ہوشمند

ہے ایثار وابستہ اعمال سے جو واقف ہُوا چھُٹ گیا جال سے

ہی یگ اور عمل سے غرض معرفت ہے مقصود ایک اور راہیں بہت

جو قربانیوں سے کرے اجتناب یہاں پر بھی ہی اُس کی مٹّی خراب

جو بیچتا ہے نذر اور ایثار سے — عمل ایسے ہیں سارے بیکار سے

نہیں اُسکا مسکن جہانِ بلند — کہ اِس کیلئے باب جنت ہے بند

یا اسرار مُرشد کی خدمت سے سیکھ — ریاضت سے سیکھ اور عبادت سے سیکھ

تجھے مردِ عارف دکھائے گا راہ — حقیقت پہ پڑتی ہے جس کی نگاہ

جلائیگا جب معرفت کا چراغ — ظلمت سے ہوگا پریشاں دماغ

زمین و زماں میں سماوات میں — ہے موجود ہر چیز اک ذات میں

تنا اور شاخیں ثمر اور پات — الگ ہیں مگر نخل ہے ایک ذات

گنہ سارے دھلتے ہیں عرفان سے — یہ اسرار کھلتے ہیں عرفان سے

جو کشتی میں بیٹھا ہے عرفان کی — نہیں اُس کو پرواہ طوفان کی

گنہ سوز ہے آتشِ معرفت — کسی اور شے میں نہیں یہ صفت

اگر قلب ایماں سے لبریز ہے — تو یہ کیفیت حکمت انگیز ہے

جو قابو میں رکھتا ہے اپنے حواس — پہنچتا ہے وہ بھی حقیقت کے پاس

اگر معرفت ہو تو ہے شادکام — ہے ایسوں کی منزل مقامِ سلام

مگر جس میں علم و یقیں کچھ نہیں — بجز اُسکے حق میں کہیں کچھ نہیں

نہ دُنیا میں راحت نہ عقبیٰ میں اجر — ہے دونو جہاں میں سزا اور زجر

شعورِ خدا ہے وہ تیغِ دو دم — کہ سر شرک کا ہوتا ہے اس سے قلم

جو عارف ہیں دُنیا میں اس حال کے — بری ہیں نتائج سے اعمال کے

سمجھ میں ہے یہ راز اگر آگیا   تو اُٹھ اور ہمّت کے جوہر دکھا

پانچواں ادھیائے

پھر ارجن نے پوچھا بتا اے رفیق ہیں ترکِ عمل اور عمل دو طریق

رہِ راست کا اب پتا دے مجھے جو بہتر ہو رستہ بتا دے مجھے

سری کرشن بولے کہ سُن غور سے حقیقت کو پائیگا اس طور سے

یہ دونو ہیں گو رہنمائے وصال قدم تو عمل ہی کے رستے پہ ڈال

ہے حاصل اُسی فرد کو سنیاس ستاتی ہے جس کو نہ آس اور نہ یاس

کسی چیز سے اُس کو نفرت نہیں کسی کی طرف اُس کو رغبت نہیں

جو اس طرح بالائے اضداد ہے حقیقت میں وہ رُوح آزاد ہے

سمجھتا ہے وہ جسکی ہی عقل صاف نہیں سانکھ میں یوگ سے کچھ خلاف

جہاں سانچھیہ جاکے ہے مطمئن　　پہنچتا ہے یوگی وہیں ایک دن

جو اچھی طرح ایک پر ہو عمل　　تو ملتا ہے پھر دوسرے کا بھی پھل

مگر ایسا رستہ جو ہے غیر یوگ　　کٹھن اسکو پائینگے دنیا میں لوگ

رہِ یوگ لیکن جب اُس نے چنی　　پہنچتا ہے منزل پہ جلدی مُنی

جو ہے نفس کو جانبِ "ہُو" کئے　　ہے باطن کو اپنے ترازو کئے

من اس کا کچھ ایسا ہم آہنگ ہے　　کہ ہر ایک صورت میں یکرنگ ہے

اگرچہ ہے تن اس کا مصروف کار　　مگر من میں بستا ہے پروردگار

وُہ ہے دیکھتا اور سُنتا بھی ہے　　ضرورت کی چیزوں کو چُنتا بھی ہے

وہ چھُوتا بھی ہے سُونگھتا بھی ہے وہ　　وہ سوتا بھی ہے اونگھتا بھی ہے وہ

وُہ پیتا بھی ہے اور کھاتا بھی ہے　　وُہ دیتا بھی ہے اور دلاتا بھی ہے

وہ محسوس کرتا ہی بھوک اور پیاس	غرض کام کرتے ہیں سارے حواس

نہیں رُوح کا اِس سے کچھ میل ہے	یہ احساس محسوس کا کھیل ہے

عمل اُس کا ہے سب خدا کیلئے	نہ اپنی غرض اور رضا کیلئے

وہ دُنیا میں بستا ہی یوں بے خلل	ہے بے لَوث جس طرح جَل بیچ کنول

وہ ہے بے غرض اور بے مُدّعا	کہ پائی ہے اُس نے فنا میں بقا

نہ اس کو فقط تن سے وابستگی	نہ بُدھی سے اور من سے وابستگی

الگ اس کا سُود اور بہبود ہے	صفا قلب کی اس کو مقصود ہے

نہ اجر اور عوض ہی میں اٹکا ہے دل	نہ اسباب کے ساتھ لٹکا ہے دل

جنہیں چاہئے اپنے کاموں کا پھل	وہ چکّر سے جائینگے کیوں کر نکل

مگر جس کو کچھ آرزو ہی نہیں	کسی چیز کی جُستجو ہی نہیں

نہیں قلب اس کا تب و تاب میں　　وہ ہے شاہ اس شہرِ نہ باب میں

جہاں کچھ وہ کرتا کراتا نہیں　　وہ بارِ عمل کچھ اُٹھاتا نہیں

خدا نے نہیں کوئی تدبیر کی　　یہ کڑیاں ہیں فطرت کی زنجیر کی

یہ علت، یہ معلول، عمل اور اثر　　نہیں حق نے رکھا انہیں جوڑ کر

ہے بالائے فطرت وہ ذاتِ احد　　پہنچتا نہیں اُس تلک نیک و بد

ہے عرفان پر جہل کا اک غلاف　　کہ جاہل کو دِکھتا نہیں نورِ صاف

وہ ہستی کہ ہے ماورائے فہم سے　　سمجھتا ہے کیا کچھ اُسے وہم سے

جو عرفان کا خورشید ہو جلوہ گر　　تو پھر اصلِ توحید ہو جلوہ گر

جنہیں اس طرح سے ہو حاصل وصال　　اُنہیں کو سمجھ عارفِ باکمال

نظر حق پہ گاڑے ہیں اس نحو سے ‏ ‏ کہ معلوم ہوتے ہیں کچھ محو سے

وہ بیٹھے ہیں فکر و نظر سے پرے ‏ ‏ کہ سب باخبر ہیں خبر سے پرے

اُدھر سے اِدھر پھر نہ آئیں کبھی ‏ ‏ نہ بارِ عمل پھر اُٹھائیں کبھی

کیا معرفت نے گناہوں سے پاک ‏ ‏ ہے امرت سے پاکیزہ تر انکی ذات

برہمن ہو یا کوئی چنڈال ہو ‏ ‏ ہو خوشحال یا کوئی بدحال ہو

جو عارف ہے دُنیا میں یزداں شناس ‏ ‏ پھٹکتا نہیں امتیاز اُس کے پاس

نظر پاک ہے اور پاکیزہ رائے ‏ ‏ تو یکرنگ ہیں اُسکو سگ اور گائے

اگر نفس میں وحدتِ ذات ہے ‏ ‏ تو باہر اور اندر مساوات ہے

ثبات اُسکو حاصل ہے کہسار کا کہ قائم ہے اِک پاؤں پر کار کا

وہ حالت سے اپنی نہ ہرگز پھرے نہ لذت سے اُبھرے نہ غم سے گرے

صراطِ حیات اُس کا ہے مستقیم کہ ذاتِ الٰہی میں ہے وُہ مقیم

علائق اسے شیا کے رہتا ہے دُور طبیعت میں اک سرمدی ہے سرُور

تعلق کے لذّات فانی ہیں سب تمنّائیں یاں آنی جانی ہیں سب

ہر اک لُطف سے آخرش دِل ہے سرُد کہ دُنیا میں پیدا ہی لذت سے درد

وہ لذّت، ہے بنیاد جس کی سقیم نہیں اس میں پھنستا ہے مردِ حکیم

جو رکھتے ہیں دُنیا میں عقل اور ہوش دباتے ہیں جو آرزوؤں کا جوش

اُنہیں کو سمجھنا، ہیں سچے سکھی ہے حاصل اُنہیں راحتِ ایزدی

جو مرنے سے پہلے یہاں مر گیا — وہ آزاد ہے سوئے داور گیا

نہیں دل میں کوئی ہوا و ہوس — بدن اُس کا ہرگز نہیں ہے قفس

سُرورِ اسکو حاصل ہے دِلشاد ہے — وہ چھُٹنے سے پہلے ہی آزاد ہے

ہے باطن میں جس دِل کو حاصل سرور — ہے جس دل میں ذاتِ الٰہی کا نور

نہ ہے قید اُسکو نہ کچھ بند ہے — وہ اک ذاتِ یکتا میں پیوند ہے

جو دل سے دوئی کا نشاں مِٹ گیا — تو ہر اک گنہ بے گماں مِٹ گیا

گر احساس و احوال میں ضبط ہے — تو دل میں توازن ہے اور ربط ہے

نہیں ہی پھر اپنوں میں غیروں میں فرق — کہ من ہی جہاں کی بھلائی میں غرق

بدن میں ہے مُکتی کا سامان بھی — اسی تن کے اندر ہے نِروان بھی

یہ نِروان ہے معرفت سے قریب نہیں دور عاشق سے رہتے حبیب

جو اپنے تئیں نفس پہچان لے تو فوراً یہیں نقدِ نِروان لے

بُجھاتا ہے جو آرزوؤں کی آگ وہ قابو میں رکھتا ہے فطرت کی باگ

ہو دونو بھوؤں کے نظر درمیاں اور انفاس کا پاس رکھتی ہو جاں

تصرف میں عقل و حواس اور من نہ کچھ دل میں خوف اور نہ رنج و محن

جو عارف ہوا اس طرح کامیاب نہیں اُسکو بندِ عذاب و ثواب

پڑھا جس نے اچھی طرح یہ سبق ریاضت عبادت ہی سب میرا حق

سمجھتا ہے وہ عاقل نکتہ بیں کہ عالم ہیں سب میرے زیرِ نگیں

جہاں میں جو موجود و مخلوق ہے　　میں عاشق ہوں اسکا وہ معشوق ہے

اُسی کو ہے حاصل سکون اور سلام　　ہے ذاتِ الٰہی میں جس کا قیام

چھٹا ادھیائے

ادا جو کرے اِس طرح اپنا فرض　　　کہ ہر دھرم کا اس پہ گویا یہ قرض
نہ ہو کچھ نتائج کا اُس کو خیال　　　ہے اِس سنیاسی کو حاصل کمال

وُہ جوگی نہیں زاہدِ نابکار　　　فقط چھوڑ بیٹھا جو رسم و شعار
جسے یوگ کہتے ہیں اہلِ نظر　　　وہ ترکِ حقیقی ہے اے خوش گہر
بچھاتا جو تدبیر کا دام ہے　　　ابھی یوگ میں وُہ بہت خام ہے

ہے سالک کی راہِ ترقی عمل　　　یقیناً ذریعہ ہے یہ بے خلل

ہے کامل ہیں لیکن سکونِ درون　　ذریعہ ہے یہ وصل کا رہنموں

وہ کرتا ہے محسوس اشیاء کو ترک　　عمل کے ثمر اور تمنا کو ترک

سمجھتا ہے اسباب و تدبیر ہیچ　　نہیں دل میں کچھ آرزوؤں کا پیچ

نہ کر قلب کو یاس سے آشنا　　خودی کو کر اپنی سپردِ خدا

خودی ہو بجا تو خدا یار ہے　　مگر نفسِ سرکش کو تلوار ہے

خدا کو خودی ایسی مرغوب ہے　　جو اُسکی حقیقت سے منسوب ہے

وُہ ہے مطمئن گرم ہو یا کہ سرد　　نہیں اس پہ غالب نہ لذت نہ درد

نہ ہے خوفِ ننگ اور نہ پروائے نام　　ہے اُونچا بہت عارفوں کا مقام

جو پختہ ہے عارف کا گیان اور دھیان　　وُہ سیلابِ ہستی میں ہے اک چٹان

اگر اس کو حاصل ہے ضبط حواس　　تو مضبوط ہی معرفت کی اساس

غرض ہی ہُوا قلب جب اُس کا پاک　　برابر ہے پھر اُس کو زر اور خاک

نہیں فرق کچھ یار و اغیار میں　　نکوکار میں اور گنہ گار میں

عزیز و اقارب ہوں یا اجنبی　　برابر ہیں اُسکی نظر میں سبھی

جو راز حقیقت سے آگاہ ہے　　وُہ سب کا برابر بھی خواہ ہے

ہے واجب کہ جوگی ہو خلوت پسند　　در بیم و اُمید ہو اُس پہ بند

ہو اک نرم مسند پہ اُس کی نشست　　نہ بالا زمین سے بہت اور نہ پست

کرے ضبط حس من کو یکسو کرے　　طبیعت کو اپنی صفا جو کرے

رہے خوف و حزن اور شہوت سے دُور　　توازن سی پیدا ہو دل میں سرور

توجہ کو مجھ پر جماتا رہے
مجھی سے فقط لو لگاتا رہے

ہے لازم برائے حصولِ کمال
ہر اک شئے میں قائم رکھے اعتدال

نہ واجب ہے اُس کو شکم پروری
نہ فاقوں سے کرلے وہ حالت بری

رہے وسط میں اُسکی ہی یہ صفت
نہ سوئے بہت اور نہ جاگے بہت

چلے بیچ بیچ اسمیں رہتا ہی سُکھ
اسی لوگ سے دُور رہتا ہے دُکھ

خدا میں ہے قائم دلِ اولیا
لرزتا نہیں ہے دیا بے ہوا

یہی ہے مقامِ سرورِ ازل
نہیں جسمیں ہوتا ہے ردّ و بدل

یہیں پر یہ ہے سب راحتِ سرمدی
یہیں پر ہے سب لذّتِ ایزدی

یہ عالم ہے اک ماورائے حواس
حقیقت سے محکم ہے جس کی اساس

کوئی کیفیت اس سے افزوں نہیں — یہاں مارتا غم شبیخوں نہیں

یقیں پختہ رکھ اور دل بے ہراس — پھٹکنے نہ پائے وہاں خوف و یاس

نہ پندار کے اس میں دھوکے ہوں کچھ — نہ جذبات کے اس میں جھونکے ہوں کچھ

ہو احساس کی عقل اگر پاسباں — رہے دل میں قائم سکوں کا سماں

جو چاہے یہاں پر خدا کا وصال — ہر اک شے کا دل سے نکالے خیال

جو سرکش ہو مرکب عناں کھینچ لے — کہ دل کو سوئے جانِ جاں کھینچ لے

نہ سرزد ہوں انساں سے جب کارِ بد — وہ ہوتا ہے ہم رنگِ ذاتِ احد

جو پہنچیگا اس طرح تجرید کو — وہ دیکھیگا کثرت میں توحید کو

نگہ جس طرف کو اُٹھے سُو بہ سُو — نظر آئے ذاتِ احد رُوبرُو

ہر اک چیز ہو ذاتِ واحد میں گم — رنگے ذرّے ذرّے کو وحدت کا خُم

موحد کے دل کو ہے حاصل سکوں　　سدا مجھ میں وہ اور میں اس میں ہوں

وہ مجھ سے کبھی چھوٹتا ہی نہیں　　یہ رشتہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں

جو واصل ہی حق میں کرے کوئی کام　　مری ذات ہی میں ہے اُس کا قیام

طبیعت جو وحدت میں یکرنگ ہے　　ہر اک حال سے وہ ہم آہنگ ہے

رہِ معرفت میں وہ کامل ہے فرد　　جو سمجھے برابر ہیں حظ اور درد

ہے وحدت کے آگے دوئی پائمال　　یہ ہے رنگِ وجدانِ اہلِ کمال

کہا اس پہ ارجن نے اے جانِ من　　عمل ایسی تعلیم پر ہے کٹھن

اگر یوگ ہے سب سکون و نجات　　تو مشکل بہت ہے طریقِ نجات

کہ ہاں مضطرب دل کی یہ چال ہے　　کہ من میں ہر اک لمحہ بھونچال ہے

وہ گھوڑا ہے ایسا کہ رکتا نہیں   جھکا ہیں جدھر کو وہ جھکتا نہیں
شرارے اڑاتی ہے ہر سمت آگ   ہوا کی نہیں موڑ سکتے ہیں باگ

دیا اس پہ مرشد نے اس کو جواب   کہ بیشک ہے دل مائل اضطراب
یہ سچ ہی کہ سرکش ہے یہ راہوار   مگر تھامتے ہیں اسے شہسوار
جو مشقِ توازن کریں متصل   تو اک روز آخر سنبھلتا ہے دل

کیا اس پہ ارجن نے پھر یہ سوال   نہ ہو یوگ میں جسکو حاصل کمال
جو باقی طبیعت میں ہیجان ہو   نہ رکتا کسی طرح طوفان ہو
جو حاصل اسے رتبہ عالی نہ ہو   مگر سینہ ایماں سے خالی نہ ہو

تباناقصوں کی ہے منزل کہاں	تلاطم زدوں کا ہے ساحل کہاں
ہے اُنکے لئے بھی کوئی اور راہ	ہے کیا یہ ضروری کہ ہوں وُہ تباہ
یہ سمجھیں کہ وہ سب فنا ہو گئے	دھواں بن گئے یا ہوا ہو گئے
بتادے کوئی ٹھیک راہِ سلوک	فقط تجھ سے ہی رفع ہونگے شکوک

کہا کرشن نے اس سے سُن اے مُرید	تجھے نفع دے گی یہ گفت و شنید
جو ایمان سے اسنی کوشش ہے	نہ بُہتان اس پر نہ کچھ دوشش ہے
وہ محفوظ ہر جا تباہی سے ہے	کہ وہ بندگان الٰہی سے ہے
یہ ہے اجرِ حق کوشئی راستباز	رہے خُلد میں ایک مُدّت دراز
گیا تھا جو عرفان کی رفعت سے گر	اِک اعلیٰ گھرانے میں آئیگا پھر

یہ ممکن ہی ہو، جوگیوں کا وہ گھر پہ ہوتی ہے مشکل نُہم ایسی سر

بدن میں اُبھرتے ہیں پہلے صفات نہیں رایگاں جاتی خُوبی کی بات

بڑھاتا ہے پھر اور آگے قدم کہ حاصل کرے کامیابی اتم

اسے کام آتی ہے مشقِ کہن کھچا جا رہا ہے وہ بے جہدِ فن

طلب یوگ کی ہے وہ فرخندہ کار طلب ہی میں طالب ہے وید و نکلے پار

وہ یوگی کہ کوشش میں ہی استوار گنہ سے ہے وہ پاک انجام کار

وہ مر مر کے سو بار جیتا گیا وہ اُمرت کے ہے جام پیتا گیا

کہ لیجائے کوشش اسے اصل تک پہنچ کر ہی رہتا ہے وہ اصل تک

اِدھر زاہد نفس کُش سخت کوش عدوئے بدن دُشمن ناؤ نوش

اُدھر عالمِ نکتہ رس بے عمل — سمجھتا ہے دانش ہی ہر شے کا حل

کسی کا سراسر عمل پر مدار — ثمر جس سے حاصل ہو اور فردِ کار

یہ تینوں ہیں رستے سے بھٹکے ہوئے — طبیعت کی اُلجھن میں اٹکے ہوئے

ہے جوگی کا ہر اک سے رتبہ بلند — کہ علم و عمل سے ہے وُہ ارجمند

یہ کوشش کر اے ارجن خوش خصال — کہ حاصل تجھے یوگ میں ہو کمال

وہ یوگی کہ حاصل ہے اُس کو یقیں — خودی چھوڑ کر ہے خُدا میں مکیں

حقیقت میں اُسکو ہے حاصل کمال — جسے ہے میسر خُدا کا وصال

ساتواں ادھیائے

جو چلتا رہا یوگ میں ٹھیک راہ — سمجھتا ہے مجھکو وہ اپنی پناہ

جو مجھ سے فقط لو لگائے رہے — نگاہوں کو مجھ پر جمائے رہے

کرم یوگ پر گر عمل ٹھیک ہے — تو سُن ایک نُکتہ جو باریک ہے

بتاتا ہوں اب تجھ کو رازِ حیات — کہ پھر جس سے آگے نہیں کوئی بات

کہ جاں کا اُجالا ہے وُہ معرفت — ہر اک شک سے بالا ہے وہ معرفت

بمشکل ہزاروں میں ہے اک مثال — کہ ہو جس کا مقصد حصولِ کمال

پھر ان کاملوں میں ہیں کم خوش صفات — جو پہنچے حقیقت میں تا سرِّ ذات

یہ پانی یہ مٹی، یہ آگ اور ہوا　　یہ آکاش اور نفس انسان کا

اسی طرح سے عقل اور پھر خودی　　ان آٹھوں میں ظاہر ہے قدرت مری

ان آٹھوں کا لیکن ہے ادنیٰ مقام　　کہ ہے پست فطرت کا ان سے قیام

بلند ان سے وہ سرِ مکتوم ہے　　ہے جس سے حیات اور وہ قیوم ہے

سبھی جانداروں کا مصدر ہے وہ　　ہر اک جان کو شکمِ مادر ہے وہ

مجھی سے نکلتی ہے ساری حیات　　ہے پھر مجھ میں واپس یہ کل کائنات

نہیں کوئی ہستی میں مجھ سے بلند　　میں ہوں ساری اشیاء کا شیرازہ بند

نہیں کوئی شے مجھ سے کھوئی ہوئی　　یہ مالا ہے مجھ میں پروئی ہوئی

ہوں پینے میں میں ہی مزا آب کا　　میں ہوں نور خورشید و مہتاب کا

فضا میں ہوں نغمہ اور آواز میں　　ہوں ہر وید میں اوم کا راز میں

مجھی سے ہے مردانگی اور زور　　مجھی سے ہے دریا کے طوفاں میں شور

میں مٹی کی خوشبو ہوں آتش کی ضو　　میں ہوں ہر جگہ زندگانی کی رو

میں معبود و جوش عبادت ہوں میں　　کہ زاہد کا زہد و ریاضت ہوں میں

مری ذات ہے سب کا تخم حیات　　نکلتی ہے مثل شجر کائنات

مجھی سے ہے عقل و خرد کا وجود　　مجھی سے ہے ساری شکوہ و نمود

مجھی سے ہے ہر زور آور کا زور　　نہیں جسمیں جوش تمنا کا شور

میں وہ آرزو ہوں جو ہے عین دھرم　　نہیں چاہیئے جسکے کرنے میں شرم

ہیں فطرت میں پھیلے ہوئے تین گن　　خیالات و اشیاء میں ہیں کارکن

ہم آہنگی ستوہ ہے حرکت رجس　　جمود اور تغافل کا ہے گن تمہ

ہوں قدرت سے موجود ہر گن میں یا　　وہ مجھ سے ہیں لیکن نہیں اُن میں میں

جہاں سارا لکھا کر فریب صفات　　نہیں جانتا یہ منزہ ہی ذات

جو واجب ہے باقی ہے فانی نہیں　　کسی رنگ میں آنی جانی نہیں

گنوں سے بنا میری مایا کا دام　　پھنسی رہتی ہی جسمیں ہر عقل خام

عجب سیمیا ہے حجاب صفات　　ذرا دیکھ اُلٹ کر نقاب صفات

مری سمت آئے جو اہل نظر　　وہ جاتا ہی مایا سے جلد ہی گزر

اگر عقل ہے مات تلبیس سے　　تو انسان بدتر ہے ابلیس سے

جو کھائے فریب حیات غرور　　وہ ہنتا ہی میری حقیقت سے دور

کوئی جس نے نیکی کمائی نہیں کبھی اسکی مجھ تک رسائی نہیں

نہ ہیں دھرم کے یہ نہ ہیں دین کے یہ اخوان ہیں سب شیاطین کے

میرے نیک بندوں کی قسمیں ہیں چار عبادت میں اُنکے الگ ہیں شعار

ہے اک وُہ کہ ہے جس کو دُکھ اور درد ہے تنگ اُس کا زر داور آہیں ہیں سرد

دوم ایسا مردِ نکوکار ہے سدا معرفت کا طلبگار ہے

ہے اک تیسرا جو غرض مند ہے حصُولِ مقاصد میں خورسند ہے

چہارم ہے وہ مردِ یزداں شناس کسی اور شے کی نہیں اُسکو پیاس

بس افضل اُسی اِک کا کردار ہے جو ذاتِ احد کا پرستار ہے

وہ طالب بھی ہے اور مطلوب بھی وہ عاشق بھی ہے اور محبُوب بھی

ہر اک اپنی اپنی جگہ نیک ہے مگر ان میں برتر وہی ایک ہے

جو کامل ہے عشق اور عرفان میں | ہے بسنا خدا ایسے انسان میں
میں اس کیلئے ہوں رہِ مستقیم | ہوں منزل بھی میں جسمیں ہے وہ مقیم
کسی بار سے کر جہاں میں جنم | پہنچتا ہے مجھ تک وہ بے رنج و غم
یہ کہتا ہے ہوکر وہ مجھ میں مکیں | ہے سب واسدیو اور کچھ بھی نہیں
جہاں میں ہے ایسوں کی نادر مثال | جنہیں اس طرح سے ہو حاصل کمال

جو اہلِ غرض ہیں عبادت گذار | ہیں رسمی عبادات اُن کا شعار
جو بے عقل ہیں آرزو میں شاد | وہ ہے مانگتا دیوتا سے مراد
بھگت دیوتاؤں کا ہے گر کوئی | عقیدے کو کرتا ہوں اُس کے قوی
اگر ان پہ ایمان رکھتا ہے وہ | تو پھل اپنی پوجا کا چکھتا ہے وہ

یہ ایمان مجھ سے ثمر مجھ سے ہے نمناؤں کا سب اثر مجھ سے ہے
جھلک ہے وہ آخر مرے نور کی اُسے مجھ سی نسبت ہی کچھ دُور کی

مگر ناقصوں کا جو مقصود ہے جو ہے اجر اس میں وہ محدود ہے
یہ ناقص گئے دیوتا کی طرف خدا اوا لے آئے خدا کی طرف

ہے جس شخص کی عقل میں کچھ فتور وہ جب دیکھتا ہے نمود و ظہور
نہیں ہے اگر عارفِ عینِ ذات سمجھتا ہے حق ہی یہی کائنات
فنا سے مبرّا ہے لیکن وہ روپ ہے نورِ ازل میں نہ چھاؤں نہ دھوپ
میرے رُخ پہ مایا کی ہے اِک نقاب چمک جس کی ہے مثلِ موجِ سراب

ہے دھوکا بہت اس سے کھایا گیا — یہ پردہ بہت کم اُٹھایا گیا

نہ میں آفریدہ نہ فانی ہوں میں — ہر اک چیز کی زندگانی ہوں میں

جو گذری، جواب ہیں، جو ہونگی کبھی — مرے علم میں ہستیاں ہیں سبھی

مگر کون ہے جو مجھے جان لے — مری اصل ہستی کو پہچان لے

تمنا و نفرت کا ہو کر شکار — ہے اضداد سے سب جہاں بیقرار

حقیقت سے دُنیا میں واقف ہیں کم — یہ دُنیا ہے ساری بھرم ہی بھرم

مگر جنکے سارے گنہ دُھل گئے — ہیں در اُن پہ اسرار کے کھُل گئے

چھٹے ہیں وہ اضداد کے وہم سے — جو بھکتی میں میری ہیں قائم ہوئے

جو لیتا ہے ذاتِ احد میں پناہ — اُسی نے ہی پائی حقیقت کی راہ

وہ کوشش میں رہتا ہے دن اور رات　　ملے آمد و شد سے اُس کو نجات

اسی کا ہے علم اور اُسی کا عمل　　اسی پر درخشاں ہے نورِ ازل

یہ قربانیاں اور یہ نذر و نیاز　　عناصر کا اور دیوتاؤں کا راز

مرا علم ہے اس طرح کا بسیط　　کہ ان ساری چیزوں پہ ہے وہ محیط

جو ہے مجھ کو اس طرح پہچانتا　　دمِ مرگ بھی ہے مجھے جانتا

آٹھواں ادھیائے

ہے کیا جوہر ہستی سرمدی — ہے کیا ذاتِ واجب فنا سے بری

کس انداز کا ہے وہ عرفانِ ذات — کہ ہے سامنے جسکے ہر علم مات

کرم کی ہے کیا کنہ، ہے کام کیا — عمل کا ہے آغاز و انجام کیا

عناصر کا دیوتاؤں اور یگ کا علم — مجھے بخش ہستی کی رگ رگ کا علم

اگر دل ہے پاکیزہ اور مطمئن — اجل جب کرے ختم جینے کے دن

ہے کیا معرفت جو دم واپسیں — ہو پیدا بہ انداز حق الیقیں

قدیم اور باقی فقط ہے وہ ذات — جو برتر ہے جس کو نہیں ہے ممات

وہی ادھیا تم ہے اے خوش صفات
کہ اصلِ حقیقت ہے عرفانِ ذات

یہ آنا یہ جانا یہ جینا یہ مرگ
عمل سے ہویدا ہے یہ ساز و برگ

عمل ایک چشمہ ہے نہریں ہیں یہ
اسی کرم ساگر کی لہریں ہیں یہ

یہ مٹی ہوا، آگ پانی کا علم
ہے میرے ظہوراتِ فانی کا علم

پرش کی ہے قوت حیات آفریں
ہے جانِ خدایانِ روشن جبیں

پرش ہی سے تخلیق کا کام ہے
ادھی دیو اسی علم کا نام ہے

پہنتا ہوں تجسیم کا میں لباس
ادھی یگیہ ہے اس سے محکم اساس

کسی کی یہ حالت ہو مرتے ہوئے
کہ گذرے مجھے یاد کرتے ہوئے

یقینی ہے پھر مرنے والے کا حال
کہ حاصل ہوا اُسکو مجھ سے وصال

دمِ مرگ جس شے کی یاد آئیگی　　اسی سمت یہ جاں کھچی جائیگی

دل اپنی تمنّا سے مغلوب ہے　　کہ طالب کی جاں ہر سُو مطلوب ہے

سدا تیرے دل میں ہو میرا خیال　　خصوصاً بوقت جہاد و قتال

مجھی سے اگر لَو لگائے گا تو　　تو بیشک مرے پاس آئیگا تو

اگر قلب تیرا نہ ہو منتشر　　توجہ سے مرکز پہ جائے ٹھہر

تو واصل ہو رُوحِ الٰہی سے تُو　　بچے ہر طرح کی تباہی سے تُو

اگر یاد اُس کی ہے دل میں نہاں　　جو ہے ماورائے زمان و مکاں

قدیم و علیم اور جہانوں کا رب　　کفِ دست میں جسکے ہیں سب کے سب

جو بیحد لطیف اور باریک ہے　　نگاہوں کا نُور اس میں تاریک ہے

وہ مہرِ ازل ذرہ افروز ہے ولیکن تجلی نظر سوز ہے

قیاس و گماں سے پرے وہم سے بہت دُور ادراک اور فہم سے

دمِ مرگ جو دل کو یکسو کئے ہے روئے خدا کی طرف رُو کئے

وُہ جاتا ہے سیدھا خدا کی طرف فنا سے گیا وہ بقا کی طرف

جسے ذاتِ باقی کہیں ویدداں تغیر کا جس میں نہیں ہے نشاں

جو ہے منزلِ ہر رہِ بے ہوس وہی طالبوں کا ہے مقصود بس

تجرد ہے جس کے لئے رہنما جسے چاہتا ہے ہر اک پارسا

بتاتا ہوں اب تجھ کو میں مختصر کہ کیا ہے طریقِ دلِ باخبر

طبیعت کو ہر ایک شے سے اکھاڑ سبھی بند کر لے بدن کے کواڑ

ہر اک سمت سے دل کو بس روک لے
دم اوپر کو کھینچ اور نفس روک لے

مری یاد میں ہو دل مستقیم
لبوں پر ہو تیرے الف واؤ میم

لبوں پر یہ اوم ایسی آواز ہے
کہ جس میں اس اک ذات کا راز ہے

دمِ مرگ ہو گر یہی کیفیّت
پہنچتا ہے منزل پہ فوراً بھگت

ہے دل جس کا لبریز یادِ خدا
نہیں جس میں گنجائشِ ماسوا

نہ بیتاب ہوگا نہ گھبرائے گا
سہولت سے مجھ تک پہنچ جائے گا

جو ہر لحظہ دل میں مرا دھیان ہے
تو مجھ تک رسائی بھی آسان ہے

پہنچ جائے مجھ تک اگر روحِ پاک
جنم کی قبا کو سمجھ چاک چاک

نہ لیگی وہ پھر اس جہاں میں جنم
کہ ہے یہ جہاں عالمِ رنج و غم

وہ پاتی ہے ایسا سکونِ ازل
نہیں ہے تغیر سے جس میں خلل

نہیں کوئی عالم کہیں پائیدار　　ہو جس میں قیام و ثبات و قرار
مگر جس کا مجھ میں ٹھکانا ہوا　　ہے ختم اُس کا سب آنا جانا ہوا

خدا کے انو کھے ہیں سال اور سِن　　ہزاروں یگوں کا ہے واں ایکدن
زمانے کے ہیں اور ہی کچھ صفات　　خدا کی ہزاروں یگوں کی ہے رات
سمجھتے ہیں جو ہیں دن اور رات کیا　　وہی جانتے ہیں یہ ہے بات کیا

ہو جس وقت روز خدا کی نمود　　عدم سے اُبھرتے ہیں سارے وجود
جہاں رات ہو جائے مرتے ہیں سب　　عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب
مگر ذات ہی اک عدم سے پرے　　تغیر سے اور بیش و کم سے پرے

اسی ذات کو ہے ہمیشہ بقا وراءُ الورا اور وراءُ الورا

وہی جاں کا مبدا وہی منتہا وہی ہے حقیقت میں فاتِ خدا

ہے فاتِ الٰہی بہشت بریں جو پہنچے وہاں پھر کے آئے نہیں

اسی سے ہے قائم جہاں کا وجود اسی سے ہے سارا شہود و نمود

یہی ہے حقیقت میں عشقِ خدا شریک تصوّر نہ ہو ما سوا

ہے مرنے کے اوقات پر بھی مدار کہ انجام کا اُن پہ ہے انحصار

سماں اک ہے وہ جبکہ جوگی مرے تو ہرگز جہاں میں نہ رجعت کرے

ہے اک وقت ایسا پھر آغوش گھر جو اس میں مرا آئیگا لوٹ کر

ہو جب روزِ روشن کا نور اور ظہور — درخشاں ہوں جس وقت نار اور نور

دو ہفتے ہوں یا نورِ مہتاب کے — سماں وہ کہ ہر من کا غنچہ کھلے

مبارک سلامت ہے وہ نصف سال — جو اُتر کی جانب ہے سورج کی چال

جو عارف مرے ایسے اوقات میں — وہ ملتا ہے اُس سرمدی ذات میں

دُھواں ہے اگر اور اندھیری ہے رات — اندھیرے میں ہر شے ہے گم اور رات

دو تاریک ہفتوں کا گر ہے سماں — مبارک نہیں وقت وہ بے گماں

یقیناً ہے منحوس وہ نصف سال — جو دکھن کی جانب ہے سورج کی چال

جو عارف مرے ایسے اوقات میں — وہ ملتا نہیں سرمدی ذات میں

وہ عالم میں مہتاب کے جائے گا — جہاں میں دوبارہ جنم پائے گا

ہے اک راہِ ظلمت تو اک راہِ نور — ہے اِک بے فتور اور اِک میں قصور

رہِ نور پر جو ہُوا خوش خرام   تو ذاتِ احد میں ہے اُس کا قیام

کرے دوسری راہ گر اختیار   تو دُنیا میں آنا ہے پھر بار بار

نہ عارف پھنسے گا کبھی موہ میں   نہ جان کو گھلائے گا اندوہ میں

لگا رہ تو ارجن سدا یوگ میں   نہ ہو جاں تیری روگ اور سوگ میں

عمل کا ثمر اور عبادات کا   عوض زہد و مشق و ریاضات کا

اسی طرح خیرات و نذر و نیاز   حصُول غرض کیلئے سب نماز

ہو جسو وقت حاصل اُسے معرفت   انہیں چھوڑ جاتا ہی پیچھے بھگت

پرے اُن سے ہی وُہ مقامِ بقا   جہاں پر فقط ہی خدا ہی خدا

نواں ادھیائے

تجھے ہی مری ذاتِ حق پر یقیں — تو اسرارِ حق میں نہیں نکتہ چیں
میں تجھ پر ہوں وہ راز اب کھولتا — اور حکمت کی وہ بات ہوں بولتا
سراسر ہے جو علم و دانش کی بات — گناہوں سے ملتی ہے جس سے نجات
یہ علموں کا علم اور رازوں کا راز — بناتا ہے انساں کو جو پاکباز
سراسر ہے یہ راستی اور دھرم — عمل میں ہے یہ صاف سہل اور نرم
جو اس میں حقیقت ہے فانی نہیں — کہ یہ راستی آنی جانی نہیں
صداقت جہاں میں اکالی ہے یہ — کہ ہر اک ملاوٹ سے خالی ہے یہ
حقیقت سے جو شخص گرتا رہا — تباہی کی راہوں میں پھرتا رہا

بھٹکتا پھرے گا کہیں کا کہیں — وہ گمراہ مجھ تک پہنچتا نہیں

مجھی سے ہی لبریز ہر ایک شے — مجھی سے ہی جو کچھ کہ دنیا میں ہے

اگرچہ میں ہر شے کی بنیاد ہوں — مگر خود جزو کل سے آزاد ہوں

تضاد اس میں سمجھے نہ کچھ نکتہ بیں — کہ سب ہستیاں مجھ میں ہیں او نہیں

میں سب کا سہارا ہوں قیوم ہوں — مگر ان میں ڈھونڈو تو معدوم ہوں

تو سلطانیٔ حق کی قدرت کو دیکھ — منزہ، مبرا، حقیقت کو دیکھ

ہواؤں کا آکاش میں ہے وجود — ہوں ایسے ہی میں مصدر ہست و بود

جو انجام پاتا ہے دورِ حیات — پلٹتی ہے میری طرف کائنات

مجھی سے دوبارہ اُبھرتی ہے پھر — مجھی سے بگڑتی سنورتی ہے پھر

مجھی سے نکلتے سنبھلتے ہیں سب — مجھی سے یہ چشمے اُبلتے ہیں سب

جو ظاہر ہوئے یا جو مستور ہیں　　وہ سب میری قدرت سے مجبور ہیں

ہے پوشیدہ از نموئے شجر　　مگر نکلے آتے ہیں برگ و ثمر

میں اعمال و حرکت کی بنیاد ہوں　　مگر خود تگ و دو سے آزاد ہوں

نہ مخلوق ہے مجھ کو پکڑے ہوئے　　نہ اعمال ہیں مجھ کو جکڑے ہوئے

سکون اور حرکت ہیں فطرت کے کھیل　　میری ذات کا کچھ نہیں ان سے میل

اسی طرح چلتا ہے فطرت کا دور　　بدلتے ہیں ایسے ہی اشیا کے طور

اگر شکل انسان کی پہنوں نقاب　　تو وہ جاہلوں کیلئے ہے حجاب

نہ سمجھے وہ پنہاں ہے اسمیں وہ ذات　　ہے سب جانداروں کی جس سے حیات

نہ علم و عمل سے ہیں وہ بہرہ مند　　نہ اُمید سے اُن کی ہمت بلند

بد اندیش و بدکار و بدبیں ہیں وہ　　کہ انسان ہو کر شیاطین ہیں وہ

ہے گردن میں جنکی ہوس کی رسن — ہیں ایندھن جہنم کے یہ اہرمن

مگر برگزیدہ اور اعلیٰ بشر — جو یزداں کی فطرت سے ہیں بہرہ ور

جو واقف ہوئے ذاتِ جاوید سے — اور آگاہ ہیں سرمدی بھید سے

لگا ہے اُسی کی طرف اُن کا من — اسی کا ہے ورد اور اُسی کا بھجن

جو مصدر ہے ہر ایک جاندار کا — نہ جس کو تغیّر نہ جس کو فنا

جو ہمت سے کرتے ہیں ہر نیک کام — وفا کرتے ہیں اپنے وعدے تمام

وُہ ہیں بندگانِ خدائے ودود — کہ ہستی ہے ان کی سراپا سجُود

عمل میں خیال اور تقریر میں — وہ ہیں محو تسبیح و تکبیر میں

فریق اور ہے ایک دانائے راز | کہ حکمت ہے ہی اُس کی نذر و نیاز

ہو وحدت کہ کثرت وُہ ہی عرقِ ہُو | وہی ہے وہی روبرو سو بہ سو

مری رُوح ہر یگ میں موجود ہے | عبادت میں بھی رُوح معبود ہے

میں قربانیاں اور منتر ہوں میں | دعا اور صدقے کے اندر ہُوں میں

بزرگوں کے ناموں کی نذر و نیاز | ہے سب میں مری ذات ہی کارساز

میں گھی اور آگ اور ہون بھی ہوں میں | جو اس پر پڑھیں وہ سخن بھی ہوں میں

سہارا جہانوں کا میں آپ ہوں | میں سب اہلِ دُنیا کا ماں باپ ہوں

میں عالم بھی ہوں اور معلوم بھی | میں قائم بھی ہوں، اور قیوم بھی

میں ہوں "اوم" کے اسمِ اعظم کا بھید | میں ہر سہ ہوں رِگ سام اور یجر وید

میں منزل ہوں اور خود ہوں راہِ حیات　　میں خود ہوں قیام اور پناہِ حیات

میں شوہر ہوں دنیا کا اور رب ہوں میں　　جو مصدر ہیں اشیا کے وہ سب ہوں میں

میں عاشق ہوں اور مبدء و منتہا　　ہوں کون و فساد اور فنا و بقا

وجود و عدم کا خزانہ ہوں میں　　اُگے جس سے دُنیا وہ دانا ہوں میں

ہے میرے ہی ہاتھوں میں بارش کی باگ　　ہیں قبضے میں میرے ہوا اور آگ

فنا و بقا اور بود و عدم　　منم ہر چہ باشد منم آں منم

یہ ویدوں کے پنڈت یہ سب سوم نوش　　نہیں جنکے اندر گناہوں کا جوش

وہ دیتے ہیں جب کچھ مرے نام پر　　ہیں جنت میں اُمیدوارِ ثمر

دعاؤں میں جنت کے خواہاں ہیں وہ　　کہ عیش اور راحت کے خواہاں ہیں وہ

وہ پاتے ہیں جنت میں بیشک مقام — جہاں دیوتاؤں سے ہیں ہم طعام

وہ جی بھر کے کھائیں پئینگے وہاں — وہ کچھ عرصہ یوں ہی جئینگے وہاں

ثمر جب کہ اعمال کا کھا چکے — جو لینا تھا ان کو وہ سب پا چکے

وہ آئینگے دُنیائے فانی میں پھر — یہ مچھلی گری اپنے پانی میں پھر

جو ویدوں میں انعام مذکور ہیں — وہی ایسے عابد کو منظور ہیں

نہیں ہے مگر اجر یہ پائدار — نہ اس کو قیام اور نہ اس کو قرار

فقط جاں ہی اُس کی بقا کیلئے — جو پوجے خدا کو خدا کیلئے

پجاری جو یاں دیوتاؤں کے ہیں — پرستار لاکھوں خداؤں کے ہیں

اگرچہ خلافِ طریقت چلے — وہ میری ہی کرتے عبادت چلے

خداوند ہوں اور بندہ نواز مجھی تک پہنچتی ہے نذر و نیاز

بصیرت نہیں تھی جنہیں ذات ہیں گرے جاکے ادنیٰ سی لذات میں

کسی کو ہر گر دیوتاؤں کی پیاس پہنچ جائیگا ایکدن اُن کے پاس

جو پتروں کی پوجا میں جائے اٹک پہنچتا ہے آباؤ اجداد تک

جو فطرت کے بھُوتوں کی پُوجا کرے عناصر سے جاکر وُہ آخر ملے

ہے عابد کو وصل اپنے معبود سے ہے طالب کا میل اپنے مقصود سے

گئے اور سب ماسوا کی طرف خدا والے آئے خدا کی طرف

کوئی ایک پتّا کوئی پھُول پھل نہ ہو کچھ بھی شئے تو بس اک گھونٹ جل

جو بھگتی سے ہو بھینٹ ہو وہ قبول نہیں اس ہلر در کار ساماں فضول

ترا کھانا پینا ہو میرے لئے تیرا مرنا جینا ہو میرے لئے

عبادت، ریاضت کہ خیرات ہو مرے واسطے تیری ہر بات ہو

عمل کی جو اچھی بری ہیں قیود نہیں اُن کا باقی رہے گا وجود

جو کھل جائے دل پر ترے رازِ ترک ہے وحدت کی نے نغمۂ سازِ ترک

جو بندہ علائق سے آزاد ہے وہ میری حقیقت میں آباد ہے

برابر ہے ہر ایک ہستی مجھے ہے یکساں بلندی و پستی مجھے

نہ مائل کسی پر نہ ہوں میں نفور نہ نزدیک اِس شی ہوں اُس سے دُور

مگر جس کی ہے میرے در پر جبیں میں اس میں ہوں اور ہے وہ مجھ میں مکیں

اگر دل سے تائب گنہگار ہے سمجھ لو کہ وہ نیک کردار ہے

کہ نیت پہ ہے سب عمل کا مدار سنور جائیگا اُس کا سب کاروبار

نہیں اس کے ایمان میں گر خلل　　اُسے ہوگا حاصل سکونِ ازل

ہوئے گرچہ گمراہ تھوڑے بہت　　نہیں ہونگے برباد میرے بھگت

اگر ویش ہو یا ہے شودر کوئی　　ہے زن بھی مری راہ پر گر کوئی

اگر کوئی پیدا ہوا پاپ سے　　ہوا کچھ قصور اس کے ماں باپ سے

غرض کوئی بھی ہے جو مجھ میں پناہ　　کشادہ ہے اس پر ترقی کی راہ

چہ جائیکہ چھتری ہو یا برہمن　　صفا کیش من اور پاکیزہ تن

یہ فانی جہاں عالم بے سرور　　ہے موج سراب اور حقیقت سے دور

گھر مٹوں اسمیں وہ ہے اک صدف　　اُسے چھوڑ کر آؤ میری طرف

عبادت تری اور نذر و نیاز　　ہو حق کیلئے جو ہے بندہ نواز

پرستش سے ہے بس یہی مدعا کہ من اپنا ذاتِ اَحد پر جما

مرے سامنے کر رکوع و سجود اگر چاہتا ہے سلام و خلود

حقیقت میں میں ایک معبود ہوں جو منزل تیری اور مقصود ہوں

دسواں ادھیائے

سری کرشن بولے کہ اے پاکباز — میں اب کھولتا ہوں حقیقت کا راز
سُناتا ہوں تجھکو کلامِ بلند — ذرا کان دھر کرشن اے ہوشمند
کہ ہے بہتری تیری مدِ نظر — مری جاں ہے تیری محبت کا گھر

رشی اور خدایانِ روشن جبیں — مرا راز اُن پر بھی افشا نہیں
نہ جانیں وہ میں کیسے پیدا ہُوا — میں دنیا میں کیسے ہویدا ہُوا
مجھی سے ہُوا اُن کا آغاز ہے — مری ذات اُن کے لئے راز ہے

اگر جان لیتا ہے مرد حکیم ہے ناآفریدہ خدائے قدیم

زمینوں کا رب آسمانوں کا رب وہی ایک ہے سب جہانوں کا رب

ہی پھر اس میں باقی نہ دھوکا نہ جھوٹ وہ جاتا ہی سارے گناہوں سے چھوٹ

مری بود ہے مصدر ہر نمود مجھی سے برآمد ہیں سارے وجود

کہیں پر ہی دھوکا کہیں گیان ہے کہیں ضبط دل اور کہیں دھیان ہے

کہیں پر ہے لذت کہیں پر الم کہیں پر وجود اور کہیں پر عدم

کہیں پر رضا اور تسلیم ہے کہیں پر رجا اور کہیں بیم ہے

کہیں پر ہے زہد و ریاضت کا زور کہیں پر ہے بہتان و شہرت کا شور

اہنسا مساوات صبر اور دان نمایاں ہی ہر ایک میں میری شان

رشی ہیں جو ست اور کنمارے ہیں چار　　منو بھی ہوئے مجھ سے ہی آشکار

انہیں سی ہے آگے یہ خلقت ہوئی　　ہے اِس نوع کی اُن سی کثرت ہوئی

جو واقف ہو اس قوت اور یوگ سے　　بری ہو گا وہ روگ اور سوگ سے

صداقت سے لبریز ہے یہ سخن　　نہ کچھ اسمیں شک اور نہ کچھ اسمیں ظن

مری ذات ہر شئے کی خلاق ہے　　نکلتی مجھی سے ہے ہر ایک شئے

جنہیں اس حقیقت کا عرفان ہے　　سدا اُن کا میری طرف دھیان ہے

انہوں نے مجھی میں جمایا ہے من　　ہے میری ہی بابت سب اُنکا سخن

وہ میرے ہی سب آرزومند ہیں　　سدا مطمئن اور خورسند ہیں

مری ذات سے جو ہم آہنگ ہیں　　مرے نغمۂ عشق کے چنگ ہیں

محبت میں اس طرح ڈوبے جو لوگ — انہیں بخشتا ہوں میں بدھی کا یوگ

مرے پاس ہے ایسی حکمت کا نور — کہ جس سے جہالت کی ظلمت ہو دور

میں سینوں میں ہوں مثلِ شمعِ حرم — ہے ظلمت رُبا میرا رحم و کرم

کیا اس سے ارجن نے پھر یہ خطاب — حقیقت تری ہی ہوا گر بے نقاب

ہر اک جاں کا ملجا و ماوا ہے تو — صفا اور عفت کا دریا ہے تو

تو ہی بے فنا ہے پرش ایزدی — ہے ذات الہٰی فقط سرمدی

رشی دیو نارد، است اور ویاس — تھی ڈول کے لب پہ بھی حمد و سپاس

ثنا تیری کرتے تھے سارے رشی — مگر آج خود تیرے منہ سے سنی

ہیں تیرے کہے کو ہوں سچ ماننا ۔ تری بات کو ہوں میں حق جاننا

نہ ہے دیوتاؤں پر افشا یہ راز ۔ نہ ہے دانوؤں پر یہ دروازہ باز

نہیں جانتے ہیں وہ تیرا ظہور ۔ ہوا کس طرح تیرا اشراق نور

کوئی غیر تجھکو ہے کب جاننا ۔ تو ہے آپ اپنے کو پہچاننا

جہاں میں ہے مطلق ترا اقتدار ۔ تجھی سے ہویدا ہیں سب جاندار

ہر اک جاں سے اُتم جگت کا پتی ۔ کہ ہے دیوتاؤں کا دیوتا تو ہی

جہانوں میں ہے جو تجلّی عیاں ۔ ذرا کھول کر اسکو کیجئے بیاں

وُہ کیا طاقتیں تیری پُر نور ہیں ۔ کہ سارے جہاں جن سے بھرپور ہیں

توجہ سے کرتا رہوں میں جو ذکر ۔ ترے کن مظاہر کو پائے گا فکر

بتا پھر سے یوگ اور تجلی کا حال		ہے بھاتا مرے دل کو تیرا مقال
طبیعت بھری اس سے میری نہیں		ان امرت سی باتوں سے سیری نہیں

سری کرشن بولے ہو تجھ پر سلام		ذرا غور سے سن یہ میرا کلام
صفات اپنے بے انت پاتا ہوں میں		جو ممتاز ہیں وہ بتاتا ہوں میں
مری ذات ہے جوہر ہر وجود		میں ہر شئے میں ہوں مرکز ہست و بود
میں اوّل ہوں وسطا اور آخر بھی ہوں		میں اندر بھی ہوں اور باہر بھی ہوں
ادتیوں میں وشنو ہوں اے میری جاں		مریچی مروتوں میں ہوں بیگماں
چمکنے میں ہر شئے سے بالا ہوں میں		ہوں سورج کہ کرنوں کی مالا ہوں میں
سمجھ مجھ کو اجرام نوری میں چاند		کہ جس کی ضیا سے ستارے ہیں ماند

مری ذات کا پا لے کچھ اس سے بھید | ہیں ویدوں میں گویا کہ ہوں سام وید
مجھے دیوتاؤں میں اِندر سمجھ | حسوں میں مجھے من کے اندر سمجھ
ہوں جس طرح میں جانداروں کا نفس | ہوں دُنیا کے سب جانداروں کا نفس
ہوں رُدروں میں شنکر کے مانند میر | اگر راکشش ہوں تو سمجھو کہ بیر
وسووں میں پاوک کی صورت ہوں میں | پہاڑوں میں خیر کی مورت ہوں میں
پُروہت ہوں تو برہسپتی جان لے | ہُوں سینا پتی تو سکند مان لے
ذخیروں میں پانی کے قلزم ہُوں میں | کہ بحرِ لقا کا تلاطم ہوں میں
اگر مہرشی ہوں تو بھرگو سمجھ | گلستانِ عرفاں کی خوشبو سمجھ
میں گویائی میں ہُوں الف، واؤ، میم | کہ ہے اسمِ اعظم یہ لفظِ قدیم
عبادت میں ہوں میں ہی ذکر اور ورد | جو پھرتا ہے ذاتِ الٰہی کے گرد

جو اشیا ہیں یاں ساکن و پُر وقار — ہیں اُن میں ہمالہ کا ہُوں کوہسار

درختوں میں پیپل کا ہُوں میں درخت — تو رشیوں میں ہوں نارد نیک بخت

گندھربوں میں ہوں میں چِترَ رتھ مثال — کپل سا ہوں سدھوں میں میں باکمال

ہوں گھوڑوں میں امرت متھن سے اُبھار — تو فیلوں میں ایراوت پُر وقار

اگر نوع انسان میں ڈھونڈو مثال — ہے شاہوں کے مانند میرا جلال

اگر اسلحہ ہُوں تو ہُوں رعد و برق — لرز جاتے ہیں جس سے سب غرب و شرق

اگر گائے ہوں کام دھینو ہوں میں — مرادوں کی جنّت ہوں مینو ہوں میں

جو افزائشِ نسل کا کام ہو — تو کندرپ اس میں مرا نام ہو

جو سانپوں میں پوچھو تو ہوں باسکی — کہ ہر خوفناک اس میں قوت بھری

اننت ان میں ہوں میں اگر ناگ ہوں — نفس جن کے جلتی ہوئی آگ ہوں

درن کی طرح آب میں ہوں اہم
اریما ہوں تیروں میں شاہوں میں اہم

حسابوں میں ہوں میں زمانے کا پھیر
درندوں میں دیکھو تو ہوں مثل شیر

اسی طرح دیتوں میں پرہلاد ہوں
ہوں جس نوع میں اسکا اُستاد ہوں

پرندوں میں ہوں نیل کنٹھ اک پرند
سواری ہے وشنو کی جس پر بلند

میں ہوں تیز رفتاریوں میں ہوا
میں ہوں رام کی طرح جنگ آزما

سمجھ لے مجھے مچھلیوں میں مگر
ہے دریاؤں میں میری گنگا سی فر

ہوں دنیا کا آغاز و انجام و وسط
بیان میں ہے مشکل مری شرح و بسط

جو علموں میں پوچھو تو ہوں علم ذات
کہ افشا ہوا جس سے راز حیات

میں ہر علم کی شرح و تفسیر ہوں
خطیب اور مناظر کی تقریر ہوں

الف ہوں میں حرفوں میں اے ہوشمند
مرکب میں دیکھو تو میں ہوں دوند

مری ذات ہے ہر طرف سُو بسُو — جدھر رُخ کو پھیرو ادھر روبرو

ہے دُنیا سبھی کارخانہ مرا — ازل سے ابد تک زمانہ مرا

مجھی سے نکلتی ہے ساری حیات — مجھی سے ہے آخر فنا اور ممات

کہیں پر ہوں فہم اور ثباتِ قدم — کہیں پر ہوں شہرت کہیں پر کرم

کہیں پر ہوں سیرت کہیں پر جمال — کہیں حافظہ ہوں کہیں ہوں خیال

اگر سام ہوں تو بہت سام ہوں — میں خوش نام ہوں اور خوش کام ہوں

میں چھندوں میں گائتری چھند ہوں — دل افروز نغموں سے خورسند ہوں

مہینوں میں ماگھ اور رُتوں میں بسنت — اگرچہ نہ آغاز میرا نہ انت

مہمات میں فتح کی ہوں مثال — ہوں سچّوں کا سچ اور جھوٹوں کی چال

ہوں ذی شان چیزوں کی شان و شکوہ — ارادوں میں ثابت ہوں مانندِ کوہ

مجھے یادوں میں سمجھو واسدیو
فرزند ہیں سب جس سے انسان و دیو

اگر پانڈوں میں ہوں ارجن قوی
تو ہیں شاعروں میں ہوں اُشنا کوی

جو منیوں کا ہو ذکر میں ہوں دیاس
وُہ منیوں کا سردار منیوں کا راس

جہاں سلطنت ہی سیاست ہُوں میں
کہ تدبیر ہر فتح و نصرت ہُوں میں

ہیں اسرار میں ہوں خموشی کی شان
مری ذات سے ہی گیانی کا گیان

جہاں میں ہُوں میں تخم بود و نمود
الگ ہو کے مجھ سے نہ ہو کچھ وجود

کھڑے اور چلتے کی میں جان ہوں
میں سب کا کفیل اور نگہبان ہوں

ہیں بے انت میرے قوائے حیات
بیاں جو ہُوا مختصر سی ہے بات

ہے جو کچھ جمال و جلال و کمال
ہے جزو الوہیت لازوال

مگر نفع کیا ایسی تمثیل سے
نہیں فائدہ کوئی تفصیل سے

نمایاں ہیں اک جزو سی سارے جگ   مگر اصل ہے پھر الگ کی الگ

گیارھواں ادھیائے

حق افروز تھا کس قدر یہ سخن — کہ افشا ہوا جس سے رازِ کہن

مرا اس سے اندوہ جاتا رہا — کرم سے ترے موہ جاتا رہا

سُنا عظمتِ غیر فانی کا حال — کہ جس کے ہیں دو رُخ جمال اور جلال

یہ پیدائش و موت و کون و فساد — رہیگی مجھے اس کی تفصیل یاد

وجودوں میں افضل جہانوں کے رب — ترا روپ دیکھوں یہ خواہش ہے اب

نگاہیں اگر لا سکیں اس کی تاب — تمنا ہے دیکھوں رُخِ آفتاب

تری ذات دیکھوں ترے رُوپ سے — ہو اندازہ خورشید کا دھوپ سے

کہا کرشن نے اے طلبگار نور
دکھاؤنگا صورت کا تجھ کو ظہور

جہاں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں رنگ
ہر اک رنگ کا کچھ نرالا ہے ڈھنگ

ہر اک طرح کے دیوتا اور ملک
ہر اک نوع کے ساکنانِ فلک

روان اور ساکن زمین اور زماں
مرے اک بدن میں ہیں سب کچھ نہاں

مظاہر وہ دیکھے گی تیری نظر
نہ دیکھے کسی نے کبھی پیشتر

مگر تیری آنکھوں میں کب یہ مجال
کہ دیکھیں وہ بے پردہ میرا جمال

ہوں کرتا تجھے آنکھ ایسی عطا
کہ جس پر ہو روشن رُخِ کبریا

ہری نے جو ارض و سما کا ہے نور
دکھایا اُسے ایشور کا ظہور

ہزاروں ہی آنکھیں ہزاروں دہن
عجب تن پہ زیور عجب پیرہن

تھے ہتھیار تن پر سجائے ہوئے　　بہت تیغ و خنجر اٹھائے ہوئے

اُبٹنے سے اُس کا بدن مشکبو　　جدھر رُخ کو پھیرو اُدھر اُس کا رُو

نہ حد اس کی کوئی نہ کچھ انتہا　　کرشمہ ہر اک اس کا حیرت فزا

جو چمکیں بیک وقت سو آفتاب　　وہ ہوں سامنے اسکے بے آب و تاب

یہ ارجن نے دیکھا کہ کل کائنات　　ہیں کثرت سی جس کے شئون و صفات

ہے سب ایک جسم الٰہی میں غرق　　نہیں شرق اور غرب میں کوئی فرق

نظر ایسے جلوے پہ کیسے پڑے　　بدن پر کھڑے ہو گئے رونگٹے

جھکا یا وہیں فرق عجز و نیاز　　کیا عرض پھر اے حقیقت طراز

عجب طرح کا دیکھتا ہوں نظام　　ترے روپ میں دیوتا ہیں تمام

کچھ اس طرح ظاہر ہیں سارے وجود — نرالی ہے ہر اک کی طرزِ نمود

برہما کا ہے تخت نیلوفری — ہے سو شان سے جس پہ جلوہ گری

ہر اک طرح کے سانپ پُر نور ہیں — رشی بھی نرے تن میں مستور ہیں

بہت سینے منہ اور آنکھیں کئی — عیاں صورتیں ہیں نئی سے نئی

ہر اک سمت پھیلا ہُوا اک وجود — نہ اسمیں تعین نہ اس میں حدود

نہ آغاز و وسط اور نہ انجام ہے — نہ ماخذ کا اس کے کوئی نام ہے

بھرا سو جلال الٰہی کا راج — دمکتے ہوئے ہر طرف تخت و تاج

وہ آتش کی صورت دمکتے ہوئے — وہ خورشید بن کر چمکتے ہوئے

فضائے فلک ہر طرف نور نور — وہ پہنائے گردوں میں تیرا ظہور

خیال و قیاس و تصور سے دور — نہ جس کو فنا اور نہ جس میں فتور

کرم کا ہے مخزن یہ ذاتِ کریم | اسی سے ہی قائم یہ دین قدیم

ہے تو سرمدی جوہر آدمی | نہ جس میں تغیر نہ کوئی کمی

تری ابتدا ہے نہ کچھ منتہا | نہ مرکز کا تیرے ہے کوئی پتا

نہ کوئی رکاوٹ نہ ہے کوئی سد | تری قوتوں کی نہیں کوئی حد

ترے بازوؤں کا نہیں کچھ شمار | سپرد ان کے ہے ہر کا کاروبار

تری آتشِ رُخ ہے کیا جلوہ گر | ہیں آنکھیں تری آفتاب اور قمر

دہکتی ہے دُنیا اسی آگ میں | جل اُٹھتی ہے دیپک کے اس راگ میں

ہیں پُر تجھ سے ارض و سماوات سب | ہیں لبریز تجھ سے مقامات سب

ترے دبدبے سے یہ تینوں طبق | لرزتے ہیں جیسے ہوا سے ورق

چلے آتے ہیں دیوتا فوج فوج　　ابھرتی ہے جس طرح دریا سے موج

ترے رعب و ہیبت سے خستہ ہیں وہ　　دعا کے لئے دست بستہ ہیں وہ

کہیں صف بہ صف ہیں کھڑے مہرشی　　کہیں پر ہے سدھوں کی کچھ بھیڑ سی

ہیں گاتے تری کبریائی کے گیت　　تری پریت ہی گویا انکی ہے ریت

تری عظمتوں کے وہ سامان ہیں　　کہ سب دم بخود اور حیران ہیں

عجب تیری ہیبت کی صورت ہے یہ　　لرزتا ہے دل ایسی مورت ہے یہ

یہ ان گنت بازو طویل اور قوی　　کئی تیرے منہ اور آنکھیں کئی

کئی دانت تیرے کئی اک دہن　　کئی لاکھ آنکھیں ہیں شعلہ فگن

مرا خوف سے منہ کو آتا ہے دل　　یہ سب دیکھ کر تھرتھراتا ہے دل

ہیں چہروں پہ جتنے دہن باز ہیں — عجب خوفناک ان کے انداز ہیں

زمیں سے نرا نور ہے تا فلک — کئی رنگ ہیں اس میں جیسے دھنک

نکلتے ہیں آنکھوں سے تیری شرر — جنہیں دیکھ کر مجھ کو لگتا ہے ڈر

اجل کے ہیں گویا یہ دندان تیز — کہ جن کی پکڑ سے نہیں کچھ گریز

کوئی ان سے بچ کر کے جائے کہاں — پناہِ خدا الاماں، الاماں

دھرت راشٹر کے جو فرزند ہیں — جوا بے راج کے آرزومند ہیں

اسی طرح بھیشم درون اور کرن — کئی ساتھ ان کے شہانِ زمن

ہمارے بہادر کئی جنگ جو — انہیں سربسر کھائے جاتا ہے تو

ڈھکیلے لئے جارہی ہے اجل — ترے منہ میں جاتے ہیں سب سر کے بل

کئی ایک بدبخت بھٹکے ہوئے ہیں دانتوں میں سر اُن کے اٹکے ہوئے

ہوں جس طرح سیلاب میں ندیاں سمندر کی جانب رواں اور دواں

بڑے سورما اور بڑے حکمراں جنہیں دیکھ کر کانپتا تھا جہاں

ترے منہ میں یہ سب گریزاں گئے اسی طرح اُفتاں و خیزاں گئے

پتنگے گریں شمع پر جس طرح ترے منہ میں گرتے ہیں یہ اس طرح

انہیں کھا کے ہے تُو زباں چاٹتا اسی طرح سارا جہاں چاٹتا

یہ ہیبت کی آگ اور یہ نارِ جلال جہاں جل اُٹھا اس سے اے لایزال

یہ طوفان و سیلاب ہستی ہے کیوں یہ موت اس طرح سے برستی ہے کیوں

بغیر اس کو جانے نہ آئیگا چین　　ہے کیا اصل میں تیری ذات اور عین

ہے کس ذات کا یہ جلالی ظہور　　حقیقت میں کیا ہیں یہ نار اور نور

کہا کرشن نے غور سے بات سُن　　حقیقت نما ہے یہ میرا سخن

زمانہ ہوں میں اور اجل کی ہوا لہر　　پیامِ فنا ہے میرا غیض و قہر

ہوں مخلوق کی اور جہانوں کی موت　　زمینوں کی موت آسمانوں کی موت

ہیں جنگ آزما جو کھڑے صف بصف　　یہ سارے ہیں تیرِ قضا کے ہدف

یہ سب فوج برباد ہے موت سے　　فقط تو ہی آزاد ہے موت سے

بس اب اُٹھ کے ہو فتح سے نیکنام　　کہ ہے کام دشمن کا تجھ سے تمام

ہے تیرے لئے کشور و تخت و تاج　　یہ دولت یہ عزت یہ بھارت کا راج

مرے ہاتھ سے سب ہیں مر ہی چلے　　وہ ہیں زندگی سے لذ رہی چلے

ہے تیرے لئے بس یہی حکم رب　　ہو قتل عدو کا مجاز ہی سبب

درون اور بھیشم، کرن، جیدرتھ　　ہوئی چور چور انکے جیون کی رتھ

چلا تیر اب اور نکال اپنی تیغ　　صفایا حریفوں کا کر بے دریغ

سنا جب یہ ارجن نے پیغام جنگ　　نفس ہو گیا اُسکے سینے میں تنگ

زباں فرط دہشت سے چلتی نہ تھی　　کوئی بات مُنہ سے نکلتی نہ تھی

جھکی گردن اور ہاتھ تھے کانپتے　　مگر عرض کی ہانپتے ہانپتے

ہے سارا جہاں محو حمد و سپاس　　دل راکشس میں ہے خوف و ہراس

ہیں سدھوں کے دُنیا میں جتنے گروہ　　جھکے ہیں وہ سب دیکھکر یہ شکوہ

یہ سب تیری ہیبت سے مغلوب ہیں　　تری شان و شوکت سے مرعوب ہیں

تو علت ہے معلول سب لا و ہست　　برہم دیو بھی تجھ سے رہتے ہیں لپیت

نہیں حد تری تو ہے برتر اللہ　　تو ہی سب جہانوں کی جائے پناہ

تجھی سے ہے سارا وجود اور علم　　تجھی سے ہے قائم حدوث اور قدم

نہیں جس کو ہرگز فنا ہے وہ ذات　　سب اضداد سے ماورا ہے وہ ذات

ہے دیوتاؤں میں اولین اور عظیم　　ہے انسان کل تو ہی نفس قدیم

سبھی ہستیوں کا ہے تجھ میں مقام　　سہارا ہے تو زندگی کا مدام

تو ہے ظرف بھی اور مظروف بھی　　تو عارف بھی ہے اور معروف بھی

ہے دنیا میں تو ایسا بام بلند　　جہاں پر کسی کی نہ پہنچے کمند

ترا روپ دنیا کی بنیاد ہے　　جہاں تیری وسعت میں آباد ہے

تمہیں آگ ہو اور تمہیں ہو ہوا　　ہو پرجا پتی اور پتا کے پتا

شب تار میں تم ہو ماہِ فلک　　تمہیں دہر میں موت کے ہو ملک

نمسکار ہو تم کو ہر صبح و شام　　سلام اور سلام اور سلام اور سلام

تُو ہے نفسِ کل مصدرِ ہست و بُود　　تجھے ہر طرف سے رکوع و سجُود

سب اہلِ جہاں کا سہارا ہے تُو　　حقیقت یہ ہی دہر سارا ہے تو

ہے بے حد و پایاں ترا اقتدار　　تری طاقتوں کا نہیں کچھ شمار

میں گستاخ تھا بھُول یا پیار سے　　کوئی یار جیسے کسی یار سے

بہُت کچھ ہی واہی تباہی بکا　　ہے بیہودہ سب یا الٰہی بکا

کبھی کھیل میں تجھ سی کی کچھ ہنسی — کبھی بیٹھے باتوں میں کی دل لگی

بہت بے محل تھیں مری شوخیاں — ادب سے تھا باہر یہ طرز بیاں

بہت منہ سی نکلی ہے لاف و گزاف — خطا مجھ سی ناداں کی ہو معاف

جہانوں کے مولا جہانوں کے باپ — نہیں تیری قوت کا تول اور ناپ

گرو کے گرو اہل تعظیم کے — ہیں محتاج سب تیری تعلیم کے

کسی کو نہیں دعوئے ہمسری — تو ممکن ہو کیا تجھ سی پھر برتری

مجھے بخش دے گر کہا کچھ فضول — مرا سجدۂ عجز کر لے قبول

اگر مہرباں ہے پسر پر پدر — خطاؤں سی کرتا ہے وہ درگذر

جہاں دو دلوں میں ہی الفت کا نور — وہاں دھوئے جاتے ہیں سارے قصور

کھُلا ایسا جلوہ مِری آنکھ پر نہ آیا تھا ابتک کِسی کو نظر

خوشی سے مرا قلب لبریز ہے مگر یہ خوشی خوف آمیز ہے

بقائے جہاں و خدائے زمن تِری ذات سارے جہاں کا وطن

کرم کر مِرے حال پر ذوالجلال دکھا مجھکو پہلا سا نُور جمال

وُہ شکل حسین دلربا جانفزا وہی ہو مکٹ اور وُہی ہو عصا

یہ دیکھا کہ ہیں تیری باہیں ہزار دکھا پھر وہ تن جسمیں بازو ہیں چار

سُنا اُس نے ارجن کا جب یہ خطاب دیا اُس کو بھگوان نے یہ جواب

دکھایا ہے تجھکو وہ منظر عجیب ہُوا جو کسی کو نہ ابتک نصیب

ہمہ گیر، پر نور، بے انتہا ہر اک چیز کی جس سے ہے ابتدا

سُن اے افضل و اشرف کوروا ل　　ہوئی تجھ پہ جو میری صُورت عیاں
نہ ویداور یگ اور نہ جپ سے ملے　　نہ منتر سے حاصل نہ تپ سے ملے
نہ علم و عمل نہ عبادات سے　　نہ زہد و ریاضت نہ خیرات سے
مگر خوف کھانے کی کیا بات ہے　　یہاں تھر تھرانے کی کیا بات ہے
مری شکل دکھتی تھی جو رات دن　　وہی دیکھ پھر دل کو کر مطمئن

دکھایا اُسے اپنا پہلا جمال　　دیا خوف کو اسکے دل سے نکال
جب ارجن نے دیکھی وہ صورت حسیں　　دل افروز چہرہ کُشادہ جبیں
قرار آیا اور من ٹھکانے لگا　　وہ پہلی سی تسکین پانے لگا

جو حاصل ہوا تجھ کو دیدار ہے　　حصُول ایسی دولت کا دشوار ہے

یہاں تک ہیں سب بند رستے رہے　　ہیں دیوتا بھی دھرم ترستے رہے

مجھے تو نے دیکھا ہے جس شان سے　　نہ ویدوں سے پائے نہ پُن دان سے

ہے بھگتی مری وہ رہِ مستقیم　　عیاں جس سے ہوتا ہے نورِ قدیم

مرے عشق میں جو کہ کامل ہوئے　　وہی ذات میں میری شامل ہوئے

فقط وہ ہیں داناو بینائے ذات　　ہے بس عشق پر میرے جن کی برات

جو سب ماسوا سے نظر موڑ دے　　تعلق کی زنجیر کو توڑ دے

جسے ہے برابر، ہوا اپنا کہ غیر　　نہیں ہے کسی ایک ہستی سے بیر

یہ بے کینہ باطن یہ آزاد دل　　بھگت ہی مرا مجھ میں جائیگا مل

بارہواں ادھیائے

سوال :-

کچھ ایسے ہیں جن کی ہی یہ زندگی — کہ ہر حال میں ہے تری بندگی
ادھر نیک مشرب ہے اک اور فریق — عبادت میں جسکا الگ ہے طریق
جسے ہے برہما کی پوجا پسند — حدوث اور مظاہر سے جو ہی بلند
بتاؤ کہ کون انمیں افضل ہیں لوگ — کہ جن کا بلند اور برتر ہے یوگ

جواب :-

وہ جن کا مری سمت ہی دھیان ہے — مجھی پر یقین اور ایمان ہے

انہیں کا ہی سب سے طریقہ درست — وہی لوگ ہیں ہیں قوی اور چُست

مگر جس کا معبود ہے وہ وجود — نہ جس کا ظہور اور نہ جس کی نمود

جو ہی ہر طرح کے بیاں سے پرے — قیاس و خیال و گماں سے پرے

تغیّر، تحوّل، تبدّل سے دور — ہر اک چیز سے ہر جزو کل سے دور

نہ ہو علم سے ایسی معلوم ذات — ہیں سب جس سے قائم وہ قیّوم ذات

جنہیں ماورائے افات سے ربط ہے — حواس باطن میں بڑا ضبط ہے

ہر اک چیز پر ہے مساوی نظر — بلندی و پستی پہ حاوی نظر

ہو بہبود عالم کا جن کو خیال — ہے ایسوں کو بھی میرا حاصل وصال

مگر ذاتِ مطلق ہے "ھو" کا وطن ہے اہل بدن کو یہ رستہ کٹھن

جو ہیں دھیان مجھ پر جمائے ہوئے فقط مجھ سے ہیں لو لگائے ہوئے

نذر ہیں مری جنکے سارے عمل نہیں لوگ ہیں اُنکے کوئی خلل

وہ میری مدد سے ہیں شر سے بچے ہیں مَوت اور جنم کے بھنور سے بچے

اگر مجھ میں ہے محو عقل اور من رہیگی مری ذات تیرا وطن

توجہ نہیں گر تری استوار نہیں دل میں تیرے قیام و قرار

تو لے کام زہد اور ریاضات سے کہ مقصد ہو حاصل اسی بات سے

ریاضات میں بھی اگر خام ہو تو بس میری خدمت ترا کام ہو

کرے سب اگر کام میرے لئے　　تو مکتی یقینی ہے تیرے لئے

جو خدمت کی بھی تجھ میں طاقت نہو　　کسی کام کرنے کی ہمت نہو

تو ترکِ تمنائے اجر و ثواب　　ہے تیرے لئے اِک سعادت کا باب

پنہ مجھ میں لے اور سب چھوڑ دے　　تعلق کی زنجیر کو توڑ دے

ریاضات سے خوب تر ہے گیان　　مگر گیان سے اور اُوپر ہے دھیان

ہے ترکِ جزا دھیان سے خوب تر　　کہ ہے شانتی ترک ہی کا ثمر

جو رکھتا نہیں ہے کسی سے کبھی بیر　　پریمی ہے سب کا ہو اپنا کہ غیر

طبیعت ہی رحم و کرم سے بھری　　خودی اور تعلق سے جو ہے بری

توازن کا ہے جس کی فطرت میں راج　　کہ دُکھ اور سُکھ میں ہے قائم مزاج

جو ثابت ہے راسخ ہی اور مطمئن　　ہے من جس کا مجھ میں لگا رات دن

وہ پاتا ہے مجھ سے سہارا بہت　　بھگت ایسا مجھکو ہے پیارا بہت

نہ وہ اہلِ عالم سے بیزار ہے　　نہ دُنیا کو کچھ اس سے آزار ہے

ہے طوفانِ جذبات سے بے اثر　　نہ رنج اور مسرت نہ غصہ نہ ڈر

نہ جسکو کرے مضطرب کوئی چیز　　بھگت ایسا مجھکو بہت ہے عزیز

پھسلتا نہیں جو کسی بات میں　　نہ ہے مضطرب اپنی حاجات میں

جسے اپنی کوئی غرض ہی نہیں جسے خواہشوں کا مرض ہی نہیں
جو بے لوث ہے اور ہشیار ہے بس ایسے بھگت سے مجھے پیار ہے

نہ اشیا سے رکھتا ہے رغبت کبھی نہ اسکو کسی سے ہے نفرت کبھی
تمنا و غم سے نہیں پیچ و تاب نہ کچھ اس کو فکرِ عذاب و ثواب
سراسر علائق سے آزاد ہے وہ میری حقیقت میں آباد ہے

کوئی دوست اس کا ہو یا ہو عدو بدلتا نہیں وہ طبیعت کی خو
جسے ہے برابر ہو لذّت کہ درد برابر زمانہ کا ہے گرم و سرد
نہ ہی شوقِ نام اور نہ پروائے ننگ ہر اک رنگ میں جس کا ہی ایک ڈھنگ

کسی آرزو میں نہ لٹکائے دل تمنا میں ہرگز نہ اٹکائے دل

قناعت گزیں، کم سخن، مستقل سدا اپنی حالت پہ قائم ہو دل

کوئی اس کا اپنا ٹھکانا نہ ہو کوئی دَر نہ ہو آستانہ نہ ہو

نہ اس پر اثر کر سکے مدح و ذم نہ ہو من کے اندر غمِ بیش و کم

برابر ہے جس کیلئے ہار جیت ہے ایسے بھگت کیلئے میری پریت

جو پیتے ہیں اس دین کا آبِ حیات ہے اُن کے یقین اور عمل میں ثبات

بنا جس کا معبود و مطلوب میں اُسے دل سے رکھتا ہوں محبوب میں

تیرھواں ادھیائے

سوال :۔

پرش کیا ہے پرکرتی ہے کیسی چیز ۔ کریں رُوح و فطرت میں کیسے تمیز
ہے کیا عقل و معقول میں امتیاز ۔ ذرا کھول معلوم و عالم کا راز

جواب :۔

بدن اور پُرش کا یہ مفہوم ہے ۔ کہ ناہیں یہ عالم وہ معلوم ہے
میں عالمِ ہوُں معرُوض و معلوم کا ۔ میں عارف ہوُں ہر ایک مفہوم کا
یہ معلوم و عالمِ کا فرقِ صفت ۔ اسی کے سمجھنے میں ہے معرفت

یہ معروض اور اُسکی حقیقت ہی کیا   جو معلوم ہے اُسکی فطرت ہی کیا
ہیں عالم کے کیا کیا قوائے وصفات   ذرا غور سے سُن کہ گہری ہے بات

بہت اسمیں رشیوں کے اقوال ہیں   جو عارف ہیں اور صاحب حال ہیں
برہم سوتروں میں ہے آبِ حیات   بہت انمیں آیات ہیں بیّنات
مصفا بیان اور روشن دلیل   نہیں جس میں گنجائش قال و قیل

حس مشترک اور عشرہ حواس   ہے ساتھ انکے شامل خودی کی اساس
ہے گر پانچ اعضائے حس کا شمار   تو ایسے ہی ہیں پانچ آلات کار
یہ نفس اور محسوس و مطلوب سب   ہیں معروض ہستی میں محسوب سب

اسی میں عناصر کا بھی ہے حساب یہ خاک اور آتش، ہوا اور آب

ہے پرکرتی، درد اور لذت کا گھر یہی ہے تمنا و نفرت کا گھر

یہ ترکیب و تخریب کا سب عمل ہے معروض اور اس کا رد و بدل

بتاؤں تجھے اب ہے کیا اصل علم یہ ہے سادگی بے ریا اور حلم

اگر معرفت سے سروکار ہے تو دل بے ضرر کس میں آزار ہے

ہے گر دل تپا، ہو قدم میں ثبات ہے بڑھکر یہی سب سے حکمت کی بات

نہ ہو شاد و ناشاد محسوس ہے طبیعت ہو آزاد محسوس ہے

خودی کا کہیں پر نشاں تک نہ ہو من و تو کا اصلاً گماں تک نہ ہو

مرض اور بڑھاپے کا دھندا ہے کیا　　یہ جینے کا مرنے کا پھندا ہے کیا

حوادث پسندیدہ و ناپسند　　گذرتے رہیں دل ہو سب سے بلند

کبھی ہو نہ دامِ علائق میں قید　　نہ فرزند و زن کے تعلق کا صید

جو اس راز سے آشنا ہو گیا　　وہ عارف سراپا بقا ہو گیا

مری ذات پر جی جمائے ہوئے　　نظر ماسوا سے ہٹائے ہوئے

ہے یکسو سدا عارفِ ہوشمند　　ہے جلوت گریزا اور خلوت پسند

فقط حکمتِ ذات ہے معرفت　　یہ حکمت ہے باقی جہالت ہی سب

بتاتا ہوں اب تجھکو وہ علمِ ذات　　کہ ہے جاننا جس کا آبِ حیات

مرورِ زمانہ سے ہے ماورائے — کہیں ابتدا ہے نہ کچھ انتہا

وہ ہے ہر وجود و عدم سے پرے — زمان و مکان بیش و کم سے پرے

بہر سمت گوش و بہر سو نظر — سراپا سماع و سراپا بصر

ہے لبریز اس سے جہاں کی فضا — ہر اک سمت میں اُسکے ہیں دست و پا

سہارا لئے اس پہ ہے سارا جگ — مگر ذات ہے اُس کی سب سے الگ

وہ بے گوش لیتا ہے آواز سُن — وُہ نرگن ہی لیکن ہیں سب اسمیں گُن

نہیں کوئی اعضائے حس اُسکے پاس — وہ حسّاس ہے گو نہیں ہیں حواس

وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے — وہ چلتا بھی ہے اور ساکن بھی ہے

حقیقت میں ہے اسقدر وہ لطیف — کہ ادراک اس کا نہیں ہے حریف

تضاد اسمیں یہ کسقدر ہے عجیب — بہت دور ہے اور بہت ہی قریب

ہے گو ذرّے ذرّے میں اُس کا مقام　　نہیں اسکی وحدت میں کچھ انقسام

اسی سے ہے ہستی کا سب ساز و برگ　　ہے پیدائش اس سے اسی سے ہے مرگ

وہ ہے تیج کا تیج نوروں کا نور　　ہر اک طرح کی ظلمتوں سے ہے دور

وہ حکمت ہے مقصود حکمت بھی ہے　　وہی معرفت اور طریقت بھی ہے

دلوں میں ہے سب کے وہ گوشہ گزیں　　ہے ہمرنگ گویا مکاں اور مکیں

حقیقت میں ہے علم و معلوم کیا　　ہے معروض سے اصل مفہوم کیا

بیاں گرچہ یہ مختصر ہے بہت　　جو سمجھے تو واصل ہے میرا بھگت

ازل سے ہے پرکرتی اور پرش بھی　　کہ ان کی نہیں آفرینش ہوئی

یہ پرکرتی ہے معرضِ حادثات　　مقام تغیر محل صفات

اسی سے ہی علت بھی معلول بھی　　اسی سے ہی فاعل بھی مفعول بھی

مگر جب ہو حظ و الم کا بیان　　تو سمجھو کہ یاں پرش ہے درمیان

جو پرکرتی میں پرش داخل ہوا　　گنوں کا مزا اس کو حاصل ہوا

یہ ساری ملاوٹ بھلی اور بری　　گنوں میں لپٹ کر ہی ظاہر ہوئی

یہ سب کاروبار اور گنوں سے یہ میل　　ہے سب پرش ہی کی اجازت کا کھیل

وہ قیوم ہے اور ناظر بھی ہے　　حظ اندوزِ شانِ مظاہر بھی ہے

بدن میں ہے جو اس طرح سے جما　　وہی پرش ہے اور پرماتما

ہیں پرکرتی و پرش کے کیا صفات | یہی علم ہے بس کلیدِ نجات
جسے ایسا عرفان حاصل ہوا | وہ عارف سمجھ لو کہ کامل ہوا
کسی حال میں ہو وہ دل شاد ہے | وہ دورِ تناسخ سے آزاد ہے

ہیں ناظر کئی روح کی آنکھ سے | کرم یوگ سے پارہ سانکھ سے
کچھ ایسے ہیں جنہیں نہیں گیان کچھ | نہ عرفان اُنہیں نہ ہی دھیان کچھ
سُنے اور سُنائے پہ ایمان ہے | مقابل ہیں عارف کے نادان ہے
گر ایمان سی ہے عبادت گذار | سمجھ لو کہ اس کا بھی بیڑا ہے پار
سکوں میں ہے یا کوئی حرکت میں ہے | غرض چیز جو کوئی خلقت میں ہے
جہاں میں ہر اک آفرینش کی اصل | ہے عالم کا معلوم کے ساتھ وصل

رسا ہے حقیقت میں جسکی نگاہ　　وہ دیکھیگا ہر شئے میں ذاتِ الٰہ

فنا اور تغیر میں قائم ہے وہ　　وہی ایک باقی ہی دائم ہے وہ

کسی فرد میں ہو اگر یہ شعور　　کہ ہی ذاتِ احد کا سب میں ظہور

چلے گا نہ ہرگز کبھی ایسی راہ　　کہ ہو نفسِ ادنٰے سی اعلے تباہ

ہدایت کی ہے وہ رہِ مستقیم　　ہے جس میں تجلّی نورِ قدیم

جو سمجھے کہ اس میں نہیں کچھ کلام　　کہ پرکرتی کرتی ہے دُنیا کے کام

اَنا کو جو جانے عمل سے بری　　نظر اس کی ہی ہر خلل سی بری

جو دیکھے کہ ہے ایک ذاتِ بسیط جو ہے ساری کثرت پہ ہر جا محیط

ہے اک بیج سی سارا انجلِ حیات یہ سب پھول پھل ٹہنیاں اور پات

جو واقف ہو وحدت کے اس بھید سے وہ واصل ہو ذاتِ جاوید سے

نہ آغاز اس کا نہ ہیں اُسکے گُن بدن میں بھی آکر نہیں کار کُن

نہ اس میں تغیر نہ اِس پر اثر نہ اس کو فنا اور نہ اس کو ضرر

ہے آکاش دنیا میں جیسے لطیف نہ ہو وہ ملوث نہ ہو وہ کثیف

بدن میں اسی طرح ہے آتما مُبرّا، منزہ ہے جس کی صفا

چمکتا ہے اک مہر نزدیک و دور اُسی کا ہے نُور اور اُسی کا ظہور

انائے حقیقی کی ہے سب ضیا　　جو ہے سارے عالم میں ظلمت ربا

اگر معرفت سے یہ پا جائے راز　　ہے معلوم و عالم میں کیا امتیاز

عمل میں نہیں روح کا اختیار　　یہ پرکرتی، کرتی ہے سب کاروبار

حقیقت کی حد تک پہنچ جائیگا　　وہ ذات احد تک پہنچ جائیگا

چودھواں ادھیائے

میں حکمت کے موتی ہوں پھر تولتا
ہوں تجھ پر درِ معرفت کھولتا

مُنی جس سے بنتے ہیں مرانِ حال
اسی [illegible] سے پاتے ہیں اوجِ کمال

جو یوں پا گئے معرفت کے اصول
مری ذات میں کر گئے وہ حلول

نہ تخریبِ عالم میں ہوں وہ فنا
نہ تکوینِ عالم سے پائیں بقا

یہ پرکرتی ہے فاعل و لازوال
سمجھ لے کہ اک رحم کی ہے مثال

جب اس رحم میں تخم میرا پڑے
تو پیدا ہوں سب اس سے چھوٹے بڑے

کسی رحم سے جو ہویدا ہوا　　اسی ایک شکتی سے پیدا ہوا
وہ ہی رحم اور تخم ہیں آپ ہوں　　اسے ماں سمجھ اور میں باپ ہوں

ستوگن، رجوگن، تموگن کی قید　　بناتی ہے یہ روحِ انسا ان کو صید
ہیں روحی روابط گیان اور سرور　　صفائے ستوگن ہے تسکین و نور
رجوگن ہے حرص و تمنا کا دام　　ہیں زنجیر دل آرزو ہائے خام
یہ تخلیق مقصد، یہ ذوقِ حصول　　عمل کی یہ بندھن ہیں ساری فضول

تموگن سے پیدا ہی سب کاہلی　　یہ غفلت شعاری ہے اور جاہلی
ستوگن ہیں آنند ہی کا ہے راج　　رجوگن کا مقصود ہے کام کاج

تموگن ہے گویا سراپا جمود ہے جہل اور تغافل سے اس کا وجود

جو جمعیتِ دل کا طالب ہوا جمود اور حرکت پہ غالب ہوا

کہیں جذب و حرکت کو حاصل ہے فوق نہیں ہے سکون اور توازن کا ذوق

کہیں ہے تغافل سے پیدا خلل نہ ذوقِ سکوں اور نہ شوقِ عمل

ستوگن کا ہو روح میں جب وفور تو نکلے بدن کے دریچوں سے نور

جب آئے رجوگن کے ہاتھوں میں باگ تو جذبات کی پھر بھڑکتی ہے آگ

کبھی آنکھ خواہش سے بےخواب ہے کبھی دل تمنا سے بیتاب ہے

تموگن کا ہے روح پر یہ اثر اندھیرا تغافل فریبِ نظر

سکون گر ہے غالب دمِ واپسیں تو ہے منزلِ روح خلدِ بریں

جو جذبات غالب رہے مرتے دم ۔۔۔ تو اہلِ عمل میں ہُوہ لے گا جنم

جو جہل اور غفلت میں پائے وفات ۔۔۔ تو طاری ہوں پھر بھیسی کیفیات

ثمر کارِ نیکو کا شیرین و پاک ۔۔۔ ہے پھل جوش و جذبہ کا اندوہناک

جو طاری طبیعت پہ ہے کاہلی ۔۔۔ تو اُس کا نتیجہ ہے بس جاہلی

ستوگن ہُوئے لبتہ عرفان سے ۔۔۔ مگر حرص پیدا ہے ہیجان سے

تغافل ہے وجہ فریبِ نظر ۔۔۔ جہالت ہے اس کا اثر اور ثمر

ستوگن کا گر من میں انداز ہے ۔۔۔ بہت دور تک اسکی پرواز ہے

مگر کاہلی میں جو رسوا ہُوا ۔۔۔ وہ تحت الثرٰی تک لڑھکتا گیا

جو غافل رہے گا بُرے حال میں ۔۔۔ یقیناً گرے گا وہ پاتال میں

نہیں کوئی عالم سوائے صفات کہ ہے ذات سب ماورائے صفات

جو واقف ہوا اس سے کامل ہوا وہ دانائے حق مجھ میں داخل ہوا

کرے گر سہ گونہ گنوں سے عبور ہے جن کا بدن اور جہاں میں ظہور

ولادت نہ موت اور نہ پیری ہے پھر نہ رنج اور غم کی اسیری ہے پھر

سمجھ لو پیا اس نے امرت کا جام ہوئی اسکو حاصل بقائے دوام

سوال :—

سمجھ جائے جو یہ حقیقت اٹل بھنور سی گنوں کے جو جائے نکل

ہیں ایسے ولی کے علامات کیا پھر اس کے ہیں اعمال و عادات کیا

جواب :-

نہ ہے وُہ بہت آرزو مند نور نہ جذبات و ذوق عمل سے نفور

ہے حالت میں اپنی بہت استوار جسے کوئی حالت نہیں ناگوار

جو موجود ہو کچھ شکایت نہیں نہ موجود ہو گر تو رغبت نہیں

جو بیٹھا ہے ہموار اور بے طرف دل اُس کا گنوں کا نہیں ہے ہدف

جو ساکن ہی قائم ہے اور با ثبات عمل کو سمجھتا ہے کارِ صفات

ہے اس درجہ یکرنگ اُس کی نظر برابر ہیں اس کے لئے سنگ و زر

سمجھتا ہے یکساں وہ حظ و الم برابر ہیں اس کیلئے مدح و ذم

بھلی ہی یہاں یا بُری کوئی چیز نہیں انمیں کرتا وہ ہرگز تمیز

نہ ہی دوست دشمن میں کچھ امتیاز ہی تعظیم و تذلیل سے بے نیاز

نہ ہوں حس سے منسوب کوئی امور | گنوں سے وہی کرگیا ہے عبور
جو بندہ ہے عابد مرا ٹھیک ٹھیک | نہیں ماسوا کو جو کرتا شریک
وہ طے کرگیا ہے جہان صفات | ملی ذات جاوید سے اُسکی ذات
میں ہوں چشمۂ صاف آب لقا | نہ کچھ لنبڈا ہے نہ کچھ ننہا
ہُوں دین قدیم اور نور ازل | مری ذات میں ہے سُمرِ ازل

پندرھواں ادھیائے

یہ ہستی ہے کیا ہی انوکھا شجر — گڑھی ہیں جڑیں جسکی بالائے سر

لٹکتی ہیں سب ٹہنیاں سرنگوں — بغیر مثال اس کو کیسے کہوں

جو پتے ہیں اسکے ہیں آیات وید — جو سمجھا یہ سمجھا وہ ویدوں کا بھید

ہر اک سمت شاخیں ہیں بڑھتی ہوئی — لٹکتی ہوئی اور چڑھتی ہوئی

صفات اس شجر کو ہیں آبحیات — اِسے مایۂ زندگی ہیں صفات

شگوفے ہیں اس نخل کے سب حواس — گنوں سے ہی ہے جن میں رُوپ اور باس

عمل کے ہیں ریشے اسی کی جڑیں — یہ ہیں وہ جڑیں جو کہ من میں گڑیں

نہیں اِس کا انداز معلوم کچھ — نہ انجام و آغاز معلوم کچھ

اگرچہ جڑ بس ہیں بہت اسکی سخت کٹا تیغ تجرید سے یہ درخت

طریقت میں گر راہ پائے کوئی تو واپس یہاں پھر نہ آئے کوئی
ہے منزل مری وہ پرش کا مقام جہاں سے نکلتا ہے عالم تمام

علائق سے چھٹنے کے طالب ہیں جو غرور اور دھوکے پہ غالب ہیں جو
جنھوں نے کیا آرزوؤں کو سرد نہ ہی انمیں لذت نہ ہی ان میں درد
جو رہتے ہیں اس طرح سے محوِ ذات اُنہیں کو ملی ہے یہ راہِ نجات
جہاں ہے نہ سورج نہ چاند اور نہ آگ وہاں سے نہ موڑے کوئی اپنی باگ
وہیں پر ہے میرا مقامِ بلند مکاں ہے یہ میرے بھگت کو پسند

یہ جانیں تمہاری تمہارے یہ نفس　　ہیں روحِ ازل کے شرارے یہ نفس

انھوں نے جو اوڑھے ہیں پانچوں حواس　　یہ ہے جان کا عارضی سا لباس

پھر اس پر چڑھایا ہے من کا غلاف　　ہو سورج پہ بادل کا جیسے لحاف

اگر روح تن کو کرے اختیار　　تو حس ہی کرتی ہے سب کار و بار

لطافت پہ جاں کی حواس اور تن　　ہے دوشِ صبا پر شمیمِ چمن

زباں آنکھ من جلد ناک اور کان　　انہیں راہ لذت سمجھتی ہے جان

ہے محسوس اشیا سے لذت پذیر　　کہ زندانِ لذت میں ہے جان اسیر

نہیں دیکھتے جاں کو مردانِ خام ۔ نہ وقتِ وداع و نہ وقتِ قیام
گھری ہی گنوں ہیں جو جانِ بسیط ۔ صفات اُس پہ ہیں ہر طرف سے محیط
اگر کھُل گیا دیدۂ حق شناس ۔ تو ناپید ہے پھر فریبِ حواس
جو سالک کوئی معرفت کوش ہے ۔ اسے جان کی پہچان اور ہوش ہے
ملیگا نہ جاہل کو کچھ زور سے ۔ وہ دیکھیگا کیا دیدۂ کور سے
مہ و مہر کا ہر طرف نور ہے ۔ جہاں سب تجلّی سے معمور ہے
جہاں پر بھی جلتی جہانمیں ہے نار ۔ مری آتشِ رُخ سے ہی شُعلہ بار
زمیں میں ہوں میں چشمۂ زندگی ۔ مجھی سے ہے جانوں میں تابندگی
مرا سوم رس ہے نباتات میں ۔ مری تازگی پھول اور پات میں

نفس کا جہاں آنا جانا رہا	وہیں پر ہے میرا ٹھکانا رہا

میں ہوں قوتِ روح ہر جان میں	حرارت ہوں حیوان و انسان میں

مجھی سے ہے نشو و نما کا نظام	غذا ہضم کرنا ہے میرا ہی کام

ہر اک دل کے اندر ہے میرا مقام	میں ہوں عقل، یاد اور نسیان تمام

میں ہوں چاروں ویدوں کا علم اور بھید	مجھی سے ہیں ویدانت اور علم وید

پرش دو طرح کے ہیں اے مرد نیک	ہے اک ان میں فانی تو باقی ہے ایک

ہے مخلوق دریائے فانی کی لہر	ہر اک آنی جانی ہے پانی کی لہر

نہیں جس میں تبدیل باقی ہے وہ	کہ امرت ہے وہ اور ساقی ہے وہ

ہے رُوح ازل قائم و استوار	وہ ہر سب جہانوں کی پروردگار

منزہ ہوں میں سب سے برتر ہوں میں	کہ باقی و فانی سے اُوپر ہوں میں

میں بیدوں میں بھی ہوں خدا اور رب	ہے اہل جہاں میں یہ میرا لقب

جو پہچان لے حق تعالیٰ ہوں میں	فنا اور بقا سب سے بالا ہوں میں

جو سمجھے مجھی پر ہے سب کا مدار	وہ عارف ہے سچا عبادت گذار

تجھے جان کر پاک دِل با صفا	یہ سِرِّ خفی میں نے افشا کیا

جلا دل میں جب معرفت کا چراغ	تو حاصل ہی پھر ہر طرح سے فراغ

سولھواں ادھیائے

طبیعت ہو بےخوف دل پاک ہو صداقت کی راہوں میں بیباک ہو

سدا نیک مسلک پہ قائم رہے قدم راہِ عرفاں پہ دائم رہے

ہو خیرات کا شوق اور ضبطِ نفس دعا اور ریاضت سے ہو ربطِ نفس

صداقت طلب کس سے بیزار ہو سدا شانتی کا طلبگار ہو

بہت طیش کُش اور طبیعت کا نرم دل و جاں کا زیور حیا اور شرم

ہو سب جانداروں پہ رحم اور کرم اصول و قواعد پہ ثابت قدم

نہ ہو آرزوؤں کا گرداب جاں نہ حرص و ہوس سے ہو بےتاب جاں

اگر ہو جلال اور شجاعت ضرور
تو ساتھ اُسکے نیکی ہے عفوِ قصور

غرور اور حسد سے بھی ہو سینہ پاک
ہو ہر زنگ سے دل کا آئینہ پاک

ہے ان خوبیوں کا وہ مالک بشر
جو خُلقِ الٰہی سے ہے بہرہ ور

غضب اور شدّت غرور اور ریا
اندھیرا جہالت کا چھایا ہُوا

رزائل یہ ابلیس کا دین ہیں
یہ سارے صفاتِ شیاطین ہیں

ہے زنجیر، جو شیطنت کی ہر بات
صفاتِ الٰہی ہیں راہِ نجات

سن اے جن نہیں فکر کی کوئی بات
ہیں فطرت میں تیری الٰہی صفات

ہیں مخلوق میں دو طرح کے وجود
ہے دو طرح کی ان کی بُود و نمود

کوئی ان میں بندے ہیں رحمان کے　　کوئی ان میں ہیں داس شیطان کے

سنا تو نے کیا اصفیا کا ہے ڈھنگ　　طبیعت پہ اُن کی خدا کا ہے رنگ

سُن اب یہ جو شیطان کے ہیں مرید　　کج اندیش کج خلق ہیں یہ پلید

نہ ہے کچھ اوامر نواہی کا علم　　نہ راہِ نجات اور تباہی کا علم

نہیں اُنکو کچھ نیک و بد کی تمیز　　نہ اُنکے لئے راستی کوئی چیز

کوئی ان کے اندر بھلائی نہیں　　طبیعت میں انکی صفائی نہیں

ہے خلقت کی بابت یہ اُنکا بیاں　　کہ ہے بے حقیقت یہ سارا جہاں

نہیں ہے جہاں میں خدا کا وجود　　نہ ہے کوئی صدق و صفا کا وجود

نہ اس میں کوئی داد فریاد ہے نہ کچھ اس کا مقصد نہ بنیاد ہے

یہ پیدا ہوا، اتفاقات سے اندھیرے اِرادوں سے شہوات سے

یہ کج فہم انسان بدحال ہیں بہت زشت رو انکے اعمال ہیں

بھلائی سے ہر دم گریزاں ہیں یہ فساد اور تباہی کے خواہاں ہیں یہ

تمنّا کے صید اور ہوس کے شکار غرور اور تکبر ہے ان کا شعار

ہے نیّت خراب اُنکی اور چال بد خیالات فاسد ہیں، اعمال بد

نہیں اُن کا کوئی اصُول عمل ہے مقصد گریزاں اُنکا طُولِ امل

یہ دُھن ہے کہ شہوات پوری کریں انہیں میں جئیں اور انہیں میں مریں

یہ ہیں آرزوؤں کے پھندے نہیں قید
شکار غضب اور شہوت کے صید

بہت جمع کرتے ہیں مال حرام
کہ پورے کریں اس سے ارماں تمام

ہے دل آج اک کامیابی سے شاد
بر آئے گی کل اور میری مراد

مرے ہاتھ میں آج ہے مال و زر
ملیں گے کچھ آئندہ لعل و گہر

دیا میں نے آج ایک دشمن کو مار
کرونگا میں اب دوسروں کا شکار

وہ لذت وہ قدرت ہے اب روز و شب
ہے جب کہ سمجھیں مجھے لوگ رب

میں ہوں اک امیر اور ابن امیر
نہیں ملتی دنیا میں میری نظیر

کرونگا میں دان اور قربانیاں
ہیں دشواریاں مجھ کو آسانیاں

بچھایا ہے دل میں جہالت نے جال
ہراساں طبیعت، پریشاں خیال

تمنا کے پیچھے ہے آوارہ نفس
نہ مارا کبھی اُس نے امّارہ نفس

جو اس طرح دھوکے میں گھر جائیگا
وہ قعرِ جہنم میں گر جائے گا

بہت اسمیں نخوت بہت ہی غرور
وہ ہے نشۂ جاہ و دولت میں چُور

کتابِ الٰہی کے بالکل خلاف
ہے نذر و نیاز اس کی لاف و گزاف

خودی اور غضب ایسے بندے میں ہے
گلا اسکا شہوت کے پھندے میں ہے

وہ بدکیش ہے اور کج راہ ہے
حقیقت میں وہ میرا بدخواہ ہے

ہے اس کا بدن یا کوئی جسم غیر
میں سب میں ہوں اُسکو مجھی سے ہی بیر

یہ بدکار ہیں جسم، اہلِ عناد
ہے اندر فساد ان کے ہے باہر فساد

عدوئے خدا ہے یہ ظالم فریق | ہے اسکی سزا کا یہی اک طریق
کہ دنیا میں جس وقت واپس پھریں | تو رحم حرامی میں آکر گریں
یہ لیتے ہیں یوں ہی جنم پر جنم | نہ اُن کی جہالت نہ ہو مگر کم
نہ بھولے سے میری طرف جو پھرے | جہنم کی گہرائیوں میں گرے
ہیں حرص و غضب اور شہوت خراب | یہ تینوں جہنم کے ہیں تین باب
اگر دل کبھی اُن میں داخل نہ ہو | تو پیدا کبھی کوئی مشکل نہ ہو
گر اُن سے بچا تو بھلائی ہوئی | کہ مقصد تک اُسکی رسائی ہوئی
کتاب الٰہی کو جو چھوڑ کر | ہدایت سے جاتا ہے منہ موڑ کر
جلاتا ہے سینے میں شہوت کی آگ | تمنا کے ہاتھوں میں دیتا ہے باگ
نہ پائیگا ہرگز کمال اور سکھ | نہ دیکھیگا وہ کامیابی کا مکھ

ہیں کیا ٹھیک اور کیا ہیں بیہودہ کام　　ہے کیا امر و نہی و حلال و حرام

فرائض ہیں سے شاستر سے سند　　کہ معلوم ہو تجھ کو ہر نیک و بد

کرے گا عمل ہیں تری رہبری　　ہے لازم کرے اُسکی تو پیروی

سترھواں ادھیائے

سوال :-

ہے اہلِ عقیدہ میں اک وہ فریق   ہے قربانیوں میں یہ جس کا طریق

کہ کرتے ہیں ایسی روش اختیار   الگ جس سے ہے شاستر کا شعار

یہ مومن کس انداز کس دُھن میں ہیں   ستو، یا رجو، یا تموگن میں ہیں؟

جواب :-

اندھیرا ہے یا نور ہے یا امنگ   ہیں ایمان کے اس طرح تین رنگ

ہے ایماں کا فطرت پہ دار و مدار   طبیعت کے انداز پر انحصار

عقیدہ طبیعت کی تصویر ہے   طبیعت سے سیرت کی تعمیر ہے

ہے جسکی طبیعت میں نور و سرور　　خداؤں کی پوجا کرے گا ضرور

رجوگن میں معبود عفریت ہیں　　تموگن میں سب بھوت اور پریت ہیں

نہیں اس کا کچھ شاستر میں جواز　　ہے ایسی ریاضت فقط حرص و آز

خودی، کبر اور خود نمائی ہے یہ　　کہ جذبات ہی نے سجھائی ہے یہ

بدن کے عناصر کا آزار ہے　　خدا ایسی محنت سے بیزار ہے

ہے تینوں کا مرغوب کھانا جُدا　　مطابق ہی فطرت کے سب کی غذا

ریاضت ہو صدقہ ہو خیرات ہو　　ہی لازم کہ سب میں جُدا بات ہو

جو کھانا ہو جاں بخش و صحت فزا　　بدن میں اثر جس کا ہو دیر پا

طبیعت کو حاصل ہو جس سے نشاط جو پیدا کرے رُوح میں انبساط
ستوگن کا مالک یہی کھائے گا طبیعت کو اس کی یہی بھائیگا

ہے راجن کو ایسی غذا سے غرض کہ جس کا نتیجہ ہیں دُکھ اور مرض
بہت کھٹی کھاری ہو اور تیز ہو مسالہ بھری حدّت انگیز ہو

ہے تامس کو منظور ایسی خوراک نہیں جو لذیذ اور نہ تازہ نہ پاک
ہو پس خوردہ کھانا گلا اور سڑا مزا اُس کو اِس میں ملے گا بڑا

ستوگن کا مالک کرے گا وہ یگ جو ہے پھل کی خواہش سے بالکل الگ

جو ہے شاستر میں اسے مان کر کریگا اسے فرض ہی جان کر

جو قربانیوں میں، ہو مدِ نظر ملے کرنے والے کو اُس کا ثمر
نگاہوں میں اُسکی دو بالا ہو شاں ہو اوروں سے کچھ اونچی اسکی دوکاں
طبیعت میں یہ بات ہے گر بسی تو اس یگیہ کو سمجھ راجسی

بھری ہیں فقط جن میں نادانیاں ہیں سب تامسی ایسی قربانیاں
بیاں شاستر میں ہے جو صاف صاف وہ چلتے ہیں بالکل ہی اُسکے خلاف
نہ پڑھتے ہیں ان پر وہ کوئی دُعا نہ خیرات میں دیں کسی کو غذا
نہیں ایسی نذروں میں ایمان ساتھ کہ جس میں پروہت کے خالی ہیں ہاتھ

برہمن گرو، عارف اور دیوتا   ہو ان پاک نفسوں کی پوجا روا

اہنسا، برہمچریہ، پاکیزگی   سراسر ریاضت ہو یہ جسم کی

جو تقریر سچی ہے اور پر اثر   نہ کچھ اس میں دھوکا نہ اس میں ضرر

پڑھے جو کوئی وید یا شاستر   ریاضت ہو یہ نطق کی سربسر

توازن سکون و سکوت و سرور   ریاضت ہو یہ من کی آئے ذہنی شعور

یہ تینوں طرح کی ریاضت اگر   کرے دل سے بے آرزوئے ثمر

تو سمجھو کہ ایسی ریاضت ہو پاک   نہ کچھ اس میں نقصان نہ کچھ اسمیں باک

ریاضت میں ہے گر تمنائے خام   کہ حاصل کرے عزت و احترام

ریا اور نمائش کی یہ بات ہو   ریاضت نہیں یہ خرافات ہے

یہ ہے کھوکھلی اور ناپائیدار ہے جذبات پر اس کا دار و مدار

ہے اک وہ ریاضت جہالت ہے جو بدن کے لئے اک مصیبت ہی جو
بھرا ہے سراسر ارادے میں شر کہ پہنچائے اس سے کسی کو ضرر
ریاضت یہ ناپاک ہے تامسی یہ تاریکیوں سے ہے پیدا ہوئی

وہ خیرات جس میں نہ ہو کچھ غرض نہ احسان نہ کچھ آرزوئے عوض
مناسب ہو شخص اور وقت اور مقام نہ لینا حرام اور نہ دینا حرام
سمجھ لو ستوگن کا یہ دان ہے بکریگا بھی جس میں ایمان ہے

عوض اور بدلے پہ گر ہے نظر　　نتیجے کی خواہش، اُمیدِ ثمر
طبیعت کو دینا گوارا نہیں　　مگر بن دئے کوئی چارا نہیں
مکدر ہے دِل اور حیران ہے　　تو جانو کہ یہ راجسی دان ہے

بہت ایسی خیرات میں ہی خلل　　مناسب نہیں جس کا موقعہ محل
نہ کچھ لینے والا ہی حقدار ہے　　اِدھر دان کے ساتھ دھتکار ہے
ملیگی نہ اِس میں بھلائی کبھی　　کہ اِس طرح کا دان ہے تامسی

یہ اُوم تت ست ہی کیا کلام　　ہے اک ذات کا تین لفظوں میں نام
یہ اک ذات سرمد کے ہیں پیرہن　　اسی سے ہیں یگ وید اور برہمن

جو ہیں جانتے برہم اور دید کو　　ہیں پہچانتے ذاتِ جاوید کو

وہ جب تپ کریں یگ کریں یا کہ دان　　سدا آدم کہتی ہے اُن کی زبان

جو پھل چھوڑ کر طالبانِ نجات　　کریں تپ کی یا دان یا یگ کی بات

سدا اُن میں دیکھو گے تم یہ صفت　　کہ ان کی زبانوں پہ ہے لفظِ "تت"

حقیقت کے لفظوں میں اک ست بھی ہے　　حقیقت بھی ہے اور صداقت بھی ہے

ہے نیکی بھی اس لفظ ست سے مراد　　جو حق اور صداقت کی ہے خانہ زاد

ہیں ست اسکو کہتے اگر تیرا دل　　ہو تپ یگ میں اور دان میں مستقل

حقیقت کی خاطر جو ہے تیرا کام　　ہے اس کیلئے بھی یہی ٹھیک نام

ریاضت ہے یا کوئی نذر و نیاز　　عقیدت میں ہی سب حقیقت کا راز

اگر قلب ایماں سے محروم ہے — صلہ سارے کاموں کا موہوم ہے

بغیر عقیدہ یہ منتی ہے گت — اکارت ہے سب اور سب ہے اَست

اٹھارھواں ادھیائے

سوال :-

میں رکھتا ہوں تعلیم کی تجھ سی آس　　بتا دے ہی کیا ترک اور سنیاس

جواب :-

ہے سنیاس میں نے لگاؤ نہ لاگ　　ثمر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں تیاگ

یہ کرتا ہے پیش ایک عاقل فریق　　کہ ہے ترکِ اعمال اعلیٰ طریق

ہر اک کارِ دُنیا ہے بندھن کی بات　　یہ سب ترک کر دے تو پائے نجات

ہے بعضوں کی لیکن یہ رائے رہی　　عمل ترک کرنے میں ہے گمرہی

نہ یگ داں اور تپ کو چھوڑو کبھی　　ان اعمال سے منہ نہ موڑو کبھی

بتاتا ہوں تجھ کو میں مردِ خدا   کہ ہے ترک بھی تین اقسام کا

نہ کرنا ریاضت، نہ خیرات ترک   نہ ہو یگیہ کی کوئی بات ترک

طبیعت میں ان سے ہی پیدا صفا   ہیں عقل آفریں اور ظلمت ربا

اگر کوئی رکھے عمل کا خیال   ہے بہتر کرے ترک پھل کا خیال

خوشی سے کرے دان تپ اور یگ   مگر سب علائق سے ہو دل الگ

یہی میرا دین اور ایمان ہے   صداقت ہے یہ اور عرفان ہے

جو کچھ شاستر نے ہے لازم کیا   نہ کرنا عمل اُس پہ ہے ناروا

اُسے ترک کرنا ہے ظلمت کا کام   طریقہ ہے یہ تامسی اور حرام

جو کرتا ہے خوفِ مصیبت سے ترک   وہ کرتا ہی بس شوقِ راحت سے ترک

ہے ترکِ ایسا تحریکِ جذبات سے — نہ پائیگا حق کو وُہ اس بات سے

کہے جو کہ مجھ پہ ہے یہ کام فرض — کتابِ الٰہی کے احکام فرض

نہ اجر و ثمر کی ہے دل میں اُمید — نہ ہے کچھ علائق کی گفت و شنید

سمجھ لو یہ اہلِ صفا کا ہے ترک — یہ ہر ایک حق آشنا کا ہے ترک

جو تارک کہ عاقل ہیں اور باصفا — حقیقت میں جنکو نہیں شک ذرا

اُنہیں کارِ دلکش کی رغبت نہیں — مصیبت کی باتوں سے نفرت نہیں

ہے جب تک کہ ربطِ بدن جاں کیساتھ — اُٹھائیگا کیا کوئی کاموں سے ہاتھ

مگر اصل تارک ہے ایسا بشر — جو رکھے نہ اصلاً اُمیدِ ثمر

بُرا بھی ہے اچھا بھی جبرِ عمل ہے مخلوط بھی بعض کاموں کا پھل

ہے تارک کا لیکن انوکھا حساب نہ خوفِ عذاب اور نہ شوقِ ثواب

یہ ہے سانکھ درشن میں گُنہ عمل کہ ہیں پانچ تعداد میں کُل علل

سبب اوّلیں جسم ہے یا مقام دوم کوئی فاعل جو کرتا ہے کام

سوم سب وسیلے اور آلات ہیں چہارم مساعی و حرکات ہیں

ہے پنجم کسی دیوتا کی مدد یہ اسباب ہیں پانچ بے ردّ و کد

کوئی کام انسان تن سے کرے زباں سے کرے یا کہ من سے کرے

کوئی کام اچھا ہو یا ہو رذیل یہ اسباب پانچوں ہیں اسمیں دخیل

جو سمجھا خودی کو کہ فاعل ہے وہ حقیقت میں خام اور جاہل ہے وہ

خیال اُس کا یہ سر بسر وہم ہے   وہ ہے کوردل اور سِن کج فہم ہے

فریبِ خودی سے جو آزاد ہے   وہ عرفان میں پختہ بنیاد ہے

اگر اس سے ہو سارا عالم تباہ   نہ اسکو ثواب اور نہ اُس کو گناہ

حقیقت میں اُس نے نہیں کچھ کیا   نہیں ہے عمل اُس کو زنجیر پا

سہ گونہ ہے تحریک کار اے متین   کہ ہیں عالم و علم و معلوم تین

ہے تثلیث کا اک نمونہ عمل   کہ ہیں اسکے اندر سہ گونہ علل

عمل کا کوئی کرنے والا بھی ہے   عمل کے لئے کوئی آلہ بھی ہے

عمل، علم و عالم کی قسمیں ہیں تین   یہی کپل کا سانکھیہ میں ہے دین

گنوں کے سبب سے یہ تقسیم ہے　　یہی سانکھ درشن کی تعلیم ہے

ہے خالص مگر ایک علم وجود　　کہ اشیا میں کہ ذات کی ہے نمود

نہ تقسیم اس میں نہ تبدیل ہے　　نہ وحدت کی کثرت میں تحویل ہے

جو کثرت کو مطلق سمجھتا رہا　　وہ ناحق کو ہے حق سمجھتا رہا

سمجھتا ہے ہر ایک شئے ہی الگ　　کہ نے ہی الگ اور ئے ہی الگ

جو کثرت کے دھوکے میں وحدت ہو گم　　تو سمجھو اسے راجسی علم تُم

اگر دل میں شمع ہدایت ہی گُل　　سمجھتا ہے انسان جُزہی کو کُل

نہ تحقیق اسمیں نہ ہی کچھ دلیل　　یہ ادراک ہے تامسی اور ذلیل

نہیں جسمیں فاعل کو اشیاء سے ربط　　نہ اسمیں حصول ثمر کا ہے خبط

کرے جسکو تو فرض ہی جان کر　　نہ رغبت نہ نفرت کا ہو کچھ اثر
نہ ہو اس میں کوئی تمنائے خام　　حقیقت میں ہے ستوگن کا کام

جہاں ہے خودی اور تمنا کا میل　　ہے اِس کام میں سب رجوگن کا کھیل
ہے کیا منفعت دل کو اس کام سے　　کیا جس کو رنج اور آرام سے

عبث کام جسمیں نہ سوچیں مآل　　نہ غیروں کے نقصان کا کچھ خیال
سمجھا ہے جہاں خود فریبی کا دام　　تو ہے سربسر وہ تموگن کا کام
ہے عاقل وہی نیک اور پاکباز　　نہ جسمیں خودی کچھ نہ ہے حرص و آز
قدم اُس کا ثابت ہے اور استوار　　کہ اپنی صداقت پہ ہے اعتبار

ہو نا کام مقصد میں یا کامیاب   طبیعت کا اسکی ہی یکساں حساب

جو جذبات ہی میں گرفتار ہے   رہینِ ہوس مردم آزار ہے

سدا آرزوئے ثمر میں رہا   وہ دکھ اور سکھ کے بھنور میں رہا

بد اطوار اکھڑ، تلون مزاج   جو سُنتی ہے کرتا ہی سب کام کاج

بد اندیش ہے اور مایوس ہے   غرض تامسی ایسا منحوس ہے

سہ گونہ ہیں ایسے ہی عقل اور ضبط   سمجھ لو ذرا ان کا فرق اور ربط

سمجھتی ہے جو عقل خیر اور شر   وہ کہتی ہے ایسا کر، ایسا نہ کر

کہاں خوف و پرہیز کا ہے مقام   کہاں پر دلیری سی چلتا ہے کام

ہی کس شے میں قید اور کس میں نجات   کہاں پر ہی جیت اور کہاں پر ہی مات

ہے دُھندلی اگر نیک اور بد کی حد — نہ معلوم کیا نیک اور کیا ہے بد

جو ہو عقل میں اس طرح کا غبار — اُسے راجسی عقل کرنا شمار

تموگن میں جب عقل جائے پلٹ — تو ہر چیز دکھتی ہے اِسکو اُلٹ

ادھرم اس میں ہے دھرم اور شر ہے خیر — بدی سے ہے پیار اور نیکی سے بیر

اگر یوگ سے ہے طبیعت میں ضبط — اور آلات حس میں ہے نظم و ربط

ہیں قابو میں دل اور حواس اور دم — تو ہے ساتکی یہ ثبات قدم

تلاشِ فوائد میں بھٹکا ہوا — حصولِ مقاصد میں اٹکا ہوا

نتائج کی خواہش سے دل پر ہے جبر — تو ہے راجسی ایسی صورت میں صبر

جو طاری ہو رنج و ملال و غرور	نہ ہو خواب غفلت طبیعت سے دور

سمجھ لو کہ ہے تامسی اُس کا من	نہیں ستواری یہ ہے ڈھیٹ پن

میں کرتا ہوں اور اک حقیقت عیاں	سہ اقسام راحت کا اب سُن بیاں

ہے کیا لُطف انگیز مشق عمل	جو دے رنج کو راحتوں سے بدل

یہ آغاز میں ہے بہت تلخ زہر	پر انجام میں ہے یہ امرت کی لہر

جس انساں کے دل میں ہے عرفاں کا نور	اُسی کیلئے ہے یہ خالص سرور

رجوگن میں بس اسطرح کا ہے سکھ	کہ اوّل ہے سکھ اور آخر میں دُکھ

ہے محسوس اشیا سے لطف حواس	بظاہر اگرچہ بجھاتا ہے پیاس

یہ امرت نہیں جام ہے زہر کا	سدا موت انجام ہے زہر کا

مگر ایسی لذت ہے موجِ سُراب　　کہ ہے جس کا سرچشمہ نسیان و خواب

ہے دُھوکہ سراسر یہ راحت نہیں　　کہ اس سُکھ کی کوئی حقیقت نہیں

غلط ایسی حالت کا ہے نام سُکھ　　نہ آغاز سُکھ اور نہ انجام سُکھ

زمیں والے اور ساکنانِ فلک　　یہ حیواں یہ انساں یہ دیو اور ملک

ہر اک میں ہیں فاعل یہی تین گُن　　ہر اک جا پہ ہیں بس یہی کارکُن

اگر کوئی چھتری ہے یا ویش ہے　　برہمن کوئی یا صفا کیش ہے

ہے یا کوئی شودر جو ہے دون خوار　　ہے اونٹے غلامی ہی جس کا شعار

گنوں کے سبب سے یہ تقسیم ہے　　انہیں سے یہ تذلیل و تکریم ہے

جدا سب کی فطرت عمل ہے جُدا　　کسی میں خودی ہے کسی میں خدا

خدا کو اگر روح ہے مانتی ۔۔۔ تو ہے استی اس میں درشتا یہی

طبیعت میں پاکیزگی اور حلم ۔۔۔ خودی اور خدا اور خلقیت کا علم

صفات ایسے جن میں خدا کا ہے نور ۔۔۔ ہیں ضبطِ حواس اور عفوِ قصور

ستوگن سے ہیں یہ برآمد ہوئے ۔۔۔ برہمن کی فطرت سے سرزد ہوئے

ٹپکتی ہے چہرے سے شان و شکوہ ۔۔۔ اکھڑتے نہیں ہیں قدم مثل کوہ

لڑائی میں رہتا ہے جو استوار ۔۔۔ بہادر، جری چست اور ہوشیار

طبیعت میں بخشش کی ہے آرزو ۔۔۔ رچی دل میں ہے حکمرانی کی خو

یہ ہے سیرتِ چھتری خوش خصال ۔۔۔ ہے ایسی ہی مردِ بہادر کی چال

گشور کھشتا، بیوپار کھیتی کے کام ۔۔۔ یہ کرتا ہے ویشیوں میں ہر خاص و عام

مگر کام شودر کا ہے چپا کری ۔۔۔ کہ تقدیر میں اس کی ہے نوکری

موافق جو فطرت کے دائم رہے ۔۔۔ سدا اپنے کرموں پہ قائم رہے

اسی میں کمال اس کا مستور ہے ۔۔۔ کرے اسکو جس شئے پہ مجبور ہے

ہے فطرت کا قائم اسی سے نظام ۔۔۔ کرے ہر کوئی اپنا اپنا ہی کام

ہے جو ذات سر چشمۂ ہست و بود ۔۔۔ جُزو کل میں سارہی ہے جس کا وجود

اسے پوجے اپنے ہی اعمال میں ۔۔۔ کمال اُسکو حاصل ہو ہر حال میں

ہے دھرم اپنا اچھا، بُرا یا بھلا ۔۔۔ اسی پر چلا جائے انساں سدا

اگر ایک کا دھرم آسان ہے ۔۔۔ کرے دوسرا اگر تو نادان ہے

مناسب ہے فطرت کے ہر اک کا دھرم　　وفا میں نہیں اسلواری سے شرم

مقدر نے جو کام اُس کو دیا　　کرے ترک انساں تو ہے ناروا

ہو گر نقص بھی کچھ نہ چھوڑے کبھی　　نہ قسمت سے منہ اپنا موڑے کبھی

ہر اک شغل میں کچھ نہ کچھ ہے زیاں　　ہر اک آگ کیسا تھ ہے کچھ دھواں

طبیعت میں ہے جس کی صبر و غنا　　ہوس سے نہیں عقل رشتہ بپا

نہیں ہے اگر دل میں ہاہیں او آس　　تو سمجھو کہ حاصل ہوا سنیاس

اُسے ہاتھ آئے گا ایسا مقام　　جہاں ہیں نہ کوئی فرائض نہ کام

جہاں پر کوئی کام دھندا نہیں　　جہاں پر نتائج کا پھندا نہیں

ہوا اس طرح جس کو حاصل کمال ہے اُس کیلئے ذاتِ حق کا وصال

خدا تک پہنچتا ہے کیسے بشر بیاں اس کا سُن مجھ سے تو مختصر

ہو گر عقل میں جلوہ گر نورِ ذات طبیعت میں پاکیزگی اور ثبات

ہو محسوس اشیا سے آزاد دل نہ حرص و حسد سے ہو ناشاد دل

نہ رغبت نہ نفرت کرے ہوشمند ہو سب سے بلند اور خلوت پسند

ہوں قبضے میں نطق اور نفس و بدن جما ہو بس اک دھیان میں جس کا من

نہ ظلم و حسد ہو نہ کبر و غرور غضب اور حرص و ہوس سے ہو دُور

خودی سے جو اس طرح خالی ہوا وہی واصلِ ذاتِ عالی ہوا

ہوا جس کو حاصل خدا کا وصال　　وہ ہے مومن اور فرشتہ خصال

نہ کچھ آرزو ہے نہ رنج و اَلم　　برابر ہے ہر اک پہ مہر و کرم

جسے میری بھگتی کی دولت ملی　　اُسے معرفت اور حقیقت ملی

حقیقت کو پہنچے گا ایسا بشر　　کہ عشق و عبادت سے کھُلتے ہیں در

درِ معرفت جب ہُوا اُس پہ باز　　وہ سمجھیگا میری حقیقت کا راز

جو عارف ہُوا مجھ میں واصل ہُوا　　مری ذات میں وہ بھی داخل ہُوا

وہ دنیا میں کرتا رہا اپنے کام　　مگر میرے اندر ہے اُس کا مقام

نہ واں ہے تغیر نہ واں ہے فنا　　خدا ہی خدا ہے بقا ہی بقا

تو کرموں سے اپنے تعلق کو توڑ　　مجھی سے فقط رشتۂ قلب جوڑ

جسے عقل خالص کا ہے آسرا　　ہے من اُس کا میری طرف ہی لگا

ہے اب جب تو میرا ہی ہو کر رہے　　تو اپنی خودی مجھ میں کھو کر رہے

اگر دل ترا میرا طالب رہے　　تو ہر اک رکاوٹ پہ غالب رہے

مری بات سے گر کئے کان بند　　تو پہنچیگا پھر تجھ کو ایسا گزند

سراسر ضلالت میں گھر جائے گا　　گڑھے میں تباہی کے گر جائیگا

خودی کی بنا پر جھگڑتا ہی کیوں　　لڑائی نہ کرنے پہ اڑتا ہے کیوں

ارادے ہیں تیرے اکارت یہاں　　کہ لڑوائیگی تجھ کو فطرت یہاں

بندھا ہے تو فطرت کی زنجیر میں　　کرے گا جو ہے تیری تقدیر میں

خوشی سے کہ مجبور ہو کر کرے　　تو ہنس کر کرے یا کہ رو کر کرے

ہے مخلوق کے دل ہیں خالق کا گھر
ہر اک آنکھ میں ہے وُہ نورِ نظر

ہے مایا سے دُنیا میں سب ریل پیل
یہ چکر اسی کی ہے مایا کا کھیل

یہ مایا کا کیسا بنایا ہے چاک
اِسی کُوزہ گر نے چلایا ہے چاک

خدا کی طرف تو دل و جاں سے آ
وہی ہے سہارا وہی آسرا

ہو رحمت سے حاصل تجھے وہ مقام
جو رُوحِ ازل کا ہے دارالسلام

جو اسرار میں نے کیئے ہیں عیاں
ہیں مخفی سے مخفی نہاں سے نہاں

ان اسرار پر ڈال گہری نظر
پھر اس پر جو دل تیرا چاہے سو کر

سن ارجن کہ یہ راز سربستہ ہے
حقیقت کا لیکن یہی رستہ ہے

مجھے تجھ سے ہی پریت اور پیار ہے
بھلائی کی خاطر یہ گفتار ہے

لگا مجھ سے لو اور جما مجھ میں من
جھکا سامنے میرے سجدہ میں تن

مرے واسطے گر ہو نذر و نیاز — ترے واسطے ہے درِ وصل باز

مجھے پیار ہے تجھ سے اے خوش صفات — جو کہتا ہوں میں تجھ سے سچی ہے بات

تو سب دھرم کر ترک میرے لئے — کہ میں ایک کافی ہوں تیرے لئے

نہ اپنے گناہوں سے ناشاد ہو — مرا آسرا لے کے آزاد ہو

جو بندہ نہیں ہے عبادت گذار — نہ زہد و ریاضت ہے اس کا شعار

حقیقت کی جس کو نہیں ہے تلاش — کبھی اُس پہ کرنا نہ یہ رازِ فاش

نہ چاہے جو اُس کو سنانا نہیں — کبھی احمقوں کو بتانا نہیں

جو بدکار کہتے ہیں مجھ کو بُرا — کبھی ان کو دینا نہ اس کا پتا

بتائے جو بھگتوں کو سرِّ نہاں — کرے از سرِ نو اُن پر عیاں

وہ جب چھوڑ کر آب و گل جائیگا — مری ذات میں آ کے مل جائے گا

مری سب سے بہتر ہے سیوا یہی — کرے ہر مرا نام لیوا یہی

وہی سب سے بڑھ کر ہے مجھ کو عزیز — جو بھگتوں کو دے ایسی نایاب چیز

مقدس ہے یہ سب سوال و جواب — پڑھے جو خوشی سے وہی کامیاب

یہ تعلیم ہے عقل و حکمت کا یگ — جو ہے اور ندروں سے بالکل الگ

سنی جس نے سچی عقیدت سے بات — گناہوں سے پائیگا وہ بھی نجات

ہے جس دل میں اس راستی پر یقیں — نہیں ہے جو بد عیب جو نکتہ چیں

ٹھکانا ہے اس کا بھی دار السلام — جو ہے حق پرستوں کا اعلیٰ مقام

سوال :-

سُنی کان دھر کر مری بات کیا؟ سحر سے ہی بدلی تری رات کیا؟

تبا اب بھی تو دل سے قائل ہوا جو تھا وہم تجھ کو وہ زائل ہوا؟

جواب :-

ہوئی صاف دل سے جہالت کی دُھول نہیں کوئی باقی خیال فضول

نہ اب شک ہے باقی نہ بھول اور نہ چوک دھوئیں کی طرح اُڑ گئے سب شکوک

رہیگا سدا درس حق مجھ کو یاد دل و جاں سے ہونگا شریک جہاد

سانجے نے کہا :-

سری کرشن و ارجن کی یہ گفتگو بیاں میں نے جس کو کیا ہو بہو

یہ دل دوز اقوال میں نے سُنے بدن پر کھڑے ہو گئے رونگٹے

بہت مہربانی جو کی ویاس نے
سُنا سب کچھ الیشور کے اِس اُس نے

یہ سب کرشن کی ہے زباں سے سُنا
اسی کے مبارک دہاں سے سُنا

یہ حیرت فزا اور مقدّس کلام
مجھے یاد آتا ہے ہر صبح و شام

ہے اِس درس سے دل کو حاصل فراغ
طبیعت ہی اِس یاد سے باغ باغ

ھری کی ہے وہ یاد صورت مجھے
ہوئی دیکھ کر جس کو حیرت مجھے

بہت اس کا حیران کن تھا ظہور
مگر یاد اُسکی ہے کیا پُر سرور

جہاں کرشن ہو منظرِ عام پر
جہاں پر ہو ارجن کماں تھام کر

مرے دل میں ہے اس کا پُختہ یقیں
کہ ہیں دولت و فتح و نیکی وہیں